قرآن حکیم کی سورتوں

کے مضامین کا

اجمالی تجزیہ

الفاتحۃ — تا — الکہف

مؤلف

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ خدام القرآن لاہور

K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون:3-5869501

www.tanzeem.org

ترتیب

تقدیم

گزشتہ سال ریڈیو پاکستان کے لاہور اسٹیشن نے پروگرام بنایا کہ رمضان المبارک کے دوران روزانہ پندرہ منٹ کی ایک تقریر نشر کی جائے جس میں قرآن مجید کے ایک ایک پارے کے چیدہ چیدہ مضامین کا خلاصہ بیان کر دیا جائے۔ اس ضمن میں پہلے پندرہ پاروں کے لیے ع ''قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند'' مجھ سے رابطہ قائم کیا گیا تو مَیں نے عرض کیا کہ میں پاروں کی تقسیم کا سرے سے قائل ہی نہیں ہوں۔ قرآن کی اصل تقسیم سورتوں میں ہے' اگر اس بنیاد پر بیان کی اجازت ہو تو مَیں کوشش کر سکتا ہوں۔ قدرے پس و پیش کے بعد میری یہ بات تسلیم کر لی گئی۔ چنانچہ میں نے وہ تقریریں تحریر کرنی شروع کر دیں۔ لیکن جلد ہی اندازہ ہوا کہ یہ ایک نہایت مشکل کام ہے۔ قرآن حکیم کی ایک ایک آیت کی شرح و تفصیل کہیں آسان کام ہے بہ نسبت اس کے کہ اس کی سورتوں کے مضامین کا خلاصہ بیان کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لیے کہ یہاں تو معاملہ وہ ہے کہ ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست!

واقعہ یہ ہے کہ کریم قرآن کی ہر ہر آیت انسان کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے اور انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ بجائے خود علم و حکمت کا ایک عظیم موتی ہے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنا ممکن نظر نہیں آتا! الغرض عجب شش و پنج سے سابقہ پیش آیا کہ ع ''گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل'' اس لیے کہ اُدھر براڈ کاسٹنگ کارپوریشن سے 'معاہدہ' ہو چکا تھا اور ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا﴾ کا تقاضا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو وعدہ پورا کیا جائے۔ چنانچہ دل پر جبر کر کے جیسے بھی بن پڑا پندرہ تقریروں میں سورۃ الکہف تک کے اہم مضامین کا خلاصہ قلمبند کرنے کی کوشش کی' جو اَوّلاً 'میثاق' لاہور کی گزشتہ سال کی تین اشاعتوں میں شائع ہوئی تھیں اور اب بعض احباب کے اصرار پر یکجا ہدیۂ ناظرین کی جا رہی ہیں: ع ''گر قبول افتد زہے عز و شرف!

تقدیم طبع اول۔ مطبوعہ — خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ بمطابق ۱۹۸۷ء

قرآن حکیم کی سورتوں کے گروپ

ایک ہفتے میں قرآن مجید کی تلاوت مکمل کرنے کے لیے اس کی سورتوں کی سات احزاب یا منزلوں میں تقسیم تو مشہور و معروف ہے ہی، عجب حسنِ اتفاق ہے کہ مضامین کی مناسبت سے بھی قرآن حکیم کی سورتیں سات گروپوں ہی میں منقسم ہیں، جن میں سے ہر گروپ کا آغاز ایک یا متعدد مکی سورتوں سے ہوتا ہے اور اختتام ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پر۔ اور اس طرح جو گروپ وجود میں آتا ہے اس میں ایک مرکزی مضمون کی لڑی بہت نمایاں ہوتی ہے، جس میں اس کی تمام سورتیں حد درجہ معنوی حسن کے ساتھ پروئی ہوئی ہوتی ہیں۔

قرآن حکیم کی سورتوں کی ترتیب میں ایک اور بات جو بہت نمایاں نظر آتی ہے، یہ ہے کہ اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں، جیسے البقرۃ و آل عمران، النساء والمائدۃ، الانعام والاعراف اور الانفال والتوبۃ وغیرہ۔ البتہ کہیں کہیں تین تین اور چار چار سورتوں کے گروپ بھی نظر آتے ہیں، جیسے سورۂ یونس سے سورۃ الانبیاء تک تین تین کے چار اور الفرقان سے السجدۃ تک چار چار کے دو ذیلی مجموعے۔

اس تقسیم کے اعتبار سے قرآن حکیم کی سورتوں کے پہلے گروپ کی مکی سورت تو ایک ہی ہے اور وہ بھی بہت چھوٹی، اگرچہ اپنی اہمیت و جامعیت کے اعتبار سے وہ بقیہ پورے قرآن کی ہم وزن ہے، یعنی سورۃ الفاتحہ، اور مدنی سورتیں چار طویل ترین مدنیات ہیں، دو دو کے دو جوڑوں کی صورت میں۔ اس گروپ کا مرکزی مضمون ہے شریعتِ اسلامی اور اس کا تفصیلی ڈھانچہ، جو گویا جواب ہے ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ﴾ کی دعا کا، اور اہل کتاب کو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت اور ان کی ان فکری و اعتقادی اور عملی و اخلاقی ضلالتوں پر ملامت جن کے باعث وہ راندۂ درگاہِ حق ہوئے!...... جبکہ دوسرا گروپ اس اعتبار سے بہت متوازن ہے کہ اس میں ایک ہی جوڑا ''مکیات'' کا شامل ہے، یعنی

الانعام اور الاعرف اور ایک ہی ''مدنیات'' کا' یعنی الانفال اور التوبۃ! اس کا مرکزی مضمون ہے مشرکین مکہ پر بالخصوص اور جمیع اہل عرب پر بالعموم اتمامِ حجت اور ان کے انکار واعراض کی پاداش میں عذابِ استیصال کا ورود!...... تیسرے گروپ کا مرکزی مضمون ہے ''رسالت''—اور پہلے پندرہ پاروں میں اس کی ''مکیات'' کے تین تین کے تین چھوٹے گروپ ہی آ سکے ہیں۔ یعنی سورۂ یونس' سورۂ ہود اور سورۂ یوسف پہلا گروپ' اس کے بعد سورۃ الرعد' سورہ ابراہیم اور سورۃ الحجر دوسرا گروپ' اور پھر سورۃ النحل' سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف تیسرا گروپ۔ یہ مختصر تمہید اِن تقاریر میں ترتیب مطالب اور تجزیۂ مضامینِ سورِ قرآنی کے فہم میں ممد ہوگی' اِن شاء اللہ!

پہلا گروپ

الفاتحة...... تا...... المائدة

تقریر نمبر ۱

سورة الفاتحة

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ...... بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وہ ماہِ رمضان مبارک ہی کی ایک بابرکت اور قابل قدر رات تھی جس میں اب سے ایک ہزار چار سو دس سال قبل خالقِ ارض وسماء تبارک وتعالیٰ کا ازلی اور ابدی وسرمدی کلام لوحِ محفوظ سے بواسطہ جبریلِ امین علیہ السلام قلبِ محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام پر نوعِ انسانی کے لیے واضح اور روشن ہدایت بن کر نازل ہونا شروع ہوا۔ پھر وہ بھی رمضان ہی کا بابرکت مہینہ ہوتا تھا جس میں ہر سال اُس وقت تک کے نازل شدہ کلامِ الٰہی کا مذاکرہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبریل علیہ السلام سے کیا کرتے تھے۔ تا آنکہ اپنی حیاتِ دُنیوی کے آخری سال یعنی رمضان ۱۰ھ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ پورے کلامِ الٰہی کا مذاکرہ دوبار کیا -- اور اس طرح اسے ایک مرتب ومدوّن قرآن کی صورت میں اُمت کے حوالے فرمادیا۔ اور پھر دورِ خلافت راشدہ ہی میں، جو دراصل خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی، اس مرتب ومدوّن قرآن نے ایک باقاعدہ مصحف کی صورت اختیار کر لی، جس کے کروڑ ہا کروڑ نسخے دنیا میں پہلے قلم سے لکھے گئے اور ہر دَور کی اعلیٰ سے اعلیٰ طباعت سے مزین ہو کر تیار ہوتے رہے، تا آنکہ آج بلا مبالغہ اربوں کی تعداد میں صفحۂ ارضی پر موجود ہوں گے۔ اور اسی پر اِکتفا نہیں، اللہ کا یہ کلام کروڑوں خوش قسمت انسانوں کے سینوں میں محفوظ رہا جو اِس کی حنابندی

اپنے خونِ جگر سے کرتے رہے اور چودہ سو برس ہونے کو آئے کہ ہر سال رمضان المبارک میں روئے ارضی کے ایک بڑے حصے پر گویا اُس کا سالانہ جشن منایا جاتا ہے' جبکہ حفاظ پورے ذوق وانہاک کے ساتھ اپنا حفظ تازہ کرتے ہیں اور عُشاق کروڑوں کی تعداد میں اُن کے پیچھے صف بستہ ہو کر نزولِ کلامِ ربانی سے اپنے قلوب کی مردہ زمینوں کو از سرِ نو زندہ کرتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

مصحف کی پہلی یا افتتاحی سورت سورۃ الفاتحہ ہے جسے خود قرآن حکیم ہی نے ﴿**سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِی**﴾ کا خطاب بھی دیا اور ﴿**الۡقُراٰنُ الۡعَظِیۡمُ**﴾ بھی قرار دیا۔ اس کی حیثیت قرآن کے دیباچے اور مقدمے کی بھی ہے اور اُس کے فلسفہ وحکمت کے خلاصے اور لب لباب کی بھی۔ اس کا اُسلوب دُعائیہ ہے اور اس میں گویا فطرتِ انسانی کی ترجمانی کی گئی ہے۔ چنانچہ اس کے تین حصوں میں سے پہلے حصے میں ان حقائق کا بیان ہے جن تک فطرتِ صحیحہ اور عقلِ سلیم انسان کو پہنچا دیتی ہیں' یعنی اللہ کی توحید' اُس کی ربوبیتِ عامہ' اُس کی رحمت کا جوش وخروش اور ہمہ گیری و پائیداری اور اُس کی جزا وسزا' جس کے فیصلے کے لیے ایک دن معین ہے' جب اختیارِ کلی صرف اسی کے ہاتھ میں ہوگا ---- دوسرے حصے میں بات آگے بڑھتی ہے اور بندے گویا اللہ کے رُوبرو ہو کر اُس سے عہدِ وفا اُستوار کرتے ہیں کہ: ''ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے' اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگتے رہیں گے!'' ---- اور آخری حصے میں گویا عقلِ انسانی اعتراف کرتی ہے کہ رُشد وہدایت اور فوز وفلاح سے ہمکنار کرنے والے صراطِ مستقیم کی تعیین میرے بس میں نہیں' اس کے لیے انسان وحی ورسالت ہی کا محتاج ہے۔ چنانچہ ہم گویا گھٹنے ٹیک کر استدعا کرتے ہیں کہ: ''اے رب! ہمیں ہدایت بخش اُس سیدھی راہ کی' جس پر تیرے وہ بندے چلے جو تیرے انعام واکرام کے مستحق ٹھہرے اور جو نہ مغضوب ہوئے نہ گمراہ!''

سورۃ الفاتحہ کے بعد پورا قرآن حکیم بالعموم اور اُس کی پہلی چار طویل مدنی سورتیں بالخصوص گویا اس دُعا کا جواب ہیں جس میں اُس صراطِ مستقیم کی تفصیلی نشاندہی کر دی گئی ہے، جس کا ذکر سورۂ فاتحہ کے آخری حصے میں کیا گیا تھا۔

سُورۃُ البَقَرۃ

ان میں سے پہلی دو سورتیں یعنی سورۃ البقرۃ اور سورۂ آلِ عمران جنہیں آنحضورﷺ نے ''الزَّهرَاوَين'' کا خطاب دیا ہے، یعنی دو انتہائی روشن اور تابناک سورتیں، ایک نہایت حسین و جمیل جوڑے کی صورت میں ہیں، جن میں بہت سے اعتبارات سے مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ دونوں کا آغاز حروفِ مقطعات الٓمٓ اور کتابِ الٰہی کی عظمت و جلالتِ شان کے بیان سے ہوتا ہے اور دونوں کے اختتام پر انتہائی جامع دعائیں ہیں، اور بہت سے پہلوؤں سے ان دونوں کے مابین مضامین کی حد درجہ حکیمانہ تقسیم بھی پائی جاتی ہے، مثلاً جہاں سورۃ البقرۃ میں اہل کتاب میں سے یہود سے مفصل خطاب کیا گیا ہے وہاں سورۂ آلِ عمران میں نصاریٰ سے گفتگو کی گئی ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ میں ایمان کے مباحث پر زیادہ زور ہے اور سورۂ آل عمران میں اسلام کے مباحث پر اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں سورۃ البقرۃ میں جہاد بالمال یا اِنفاق فی سبیل اللہ پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور سورۂ آل عمران میں قتال فی سبیل اللہ پر۔ وقِس علٰی هٰذا!

ان میں سے پہلی اور طویل ترین سورت یعنی سورۃ البقرۃ جو ۲۸۶ آیات اور چالیس رکوعوں پر مشتمل ہے اور جسے آنحضورﷺ نے قرآنِ حکیم کے لیے ''ذروۃ السنام'' یعنی بمنزلۂ چوٹی یا نقطۂ عروج قرار دیا ہے، ماسوائے چند آیات کے پوری کی پوری آنحضورﷺ پر ہجرت کے فوراً بعد سے لے کر رمضان ۲ھ میں غزوۂ بدر سے پہلے تک کے عرصے میں جستہ جستہ نازل ہوئی۔

یہ سورۂ مبارکہ تقریباً دو مساوی حصوں پر منقسم ہے۔

پہلے حصے میں، جو۱۵۲ آیات اور ۱۸ رکوعوں پر مشتمل ہے، خطاب کا رُخ براہِ راست یا بالواسطہ اہل کتاب، بالخصوص یہود کی طرف ہے، اور دوسرے حصے میں جو بقیہ ۱۳۴ آیات اور ۲۲ رکوعوں پر مشتمل ہے، خطاب کا رُخ اُمّتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جانب ہے۔

پہلا حصہ پھر تین اجزاء پر مشتمل ہے اور اس میں عجیب توازن پایا جاتا ہے کہ درمیان میں دس رکوع وہ ہیں جن میں یہود کو براہِ راست خطاب کیا گیا ہے، اور ابتدا میں اور اختتام پر چار چار رکوع وہ ہیں جن میں روئے سخن اُن کی جانب تو ہے لیکن بطرزِ خفی ولطیف! ویسے پہلے چار رکوع نہ صرف اس سورۂ مبارکہ بلکہ پورے قرآن مجید کے مضامین کے لیے نہایت جامع تمہید بھی قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اور آخری چار رکوعوں کے مضامین کی نوعیت گویا شہنشاہِ ارض وسما کے اس فرمان کی ہے کہ امامت الناس کی وراثت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک شاخ یعنی بنی اسرائیل سے سلب کر کے دوسری شاخ یعنی بنی اسماعیل کو منتقل کی جاتی ہے، جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور جس سے اُمت مسلمہ کا اصل مرکز یعنی Nucleus فراہم ہوا ---- اور اس انتقالِ منصب امامت کی علامت (Symbol) کی حیثیت اختیار کر لی تحویل قبلہ کے واقعے نے!

اس اجمال کے بعد سورۃ البقرۃ کے نصف اوّل کے مضامین پر قدرے تفصیلی نگاہ بھی ڈال لیجیے۔

اس کے پہلے چار تمہیدی رکوعوں میں بھی مضامین کے اعتبار سے دو دو رکوعوں میں تین قسم کے انسانوں کا ذکر ہوا جو اِس سورۂ مبارکہ کے نزول کے وقت بالفعل موجود تھے۔ ایک وہ متقین ومُفلحین جو قرآن مجید کی ہدایت سے صحیح طور پر مستفید ہوئے۔ اُن کے اوصاف کے بیان کے ضمن میں اِن شرائط کی وضاحت بھی ہو گئی جو اِس کتاب کی ہدایت سے بہرہ مند ہونے کے لیے لازمی ولابدی ہیں۔ دوسرے وہ جو کفر پر اس طرح اَڑ گئے کہ اُن کے حق میں کوئی اِنذار یا تبلیغ اور نصیحت مفید نہ رہی۔ اس طرح گویا یہ قاعدہ کلیہ بیان کر دیا گیا کہ ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب انسان اپنی شامتِ اعمال سے اپنے اوپر ہدایت کا دروازہ

مستقلاً بند کرا لیتا ہے۔ تیسرے وہ جو مدعی تو ایمان کے تھے لیکن تھے حقیقتاً اس سے بالکل محروم۔ اس تیسری قسم کے انسانوں کا ذکر سب سے زیادہ تفصیل سے کیا گیا' اس لیے کہ اس میں جس کردار کی نشاندہی بغیر نام لیے کی گئی اس میں اگرچہ پیشگی طور پر مُنافقین کے کردار کی عکاسی بھی آ گئی' لیکن اصلاً یہود کے گھناؤنے کردار کو پورے طور پر بے نقاب کر دیا گیا۔

اس کے بعد کے دو رکوعوں یعنی تیسرے اور چوتھے رکوع میں قرآن مجید کی دعوت کا خلاصہ ہے' تیسرے رکوع میں مذہبی فکر کی سطح پر اور چوتھے رکوع میں فلسفہ وحکمت کی سطح پر۔ چنانچہ تیسرے رکوع کا آغاز توحید اور بندگیٔ ربّ کی دعوت سے ہوا اور اس کے بعد قرآن کے اعجاز کے ضمن میں نبوت ورسالت اور پھر جنت و دوزخ کے ضمن میں ایمان بالآخرت کا ذکر آ گیا اور اس طرح ایمانیاتِ ثلاثہ کی وضاحت ہوگئی۔ چوتھے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور اُن کے شرفِ خلافت اور خلعتِ علم سے نوازے جانے اور مسجودِ ملائک قرار پانے اور پھر ابلیس لعین کی عداوت واغواء سے جنت سے نکالے جانے کے ضمن میں گویا انسان کے مقام ومرتبہ کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اُس کے کش مکش خیر وشر میں مبتلا ہونے کا ذکر ہے' جس میں انسان کو مستقل طور پر شیطان کے اِضلال واِغواء کا سامنا رہتا ہے اور جس سے تحفظ دامنِ رسالت (علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام) کو تھامے بغیر ممکن نہیں۔ بقول شاعر:

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ!

بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حصے میں بھی یہود کے کردار کی نشاندہی کی گئی ہے کہ جس طرح ابلیسِ لعین حضرت آدم علیہ السلام کے اعزاز واکرام سے جل بُھن کر کباب ہو گیا تھا اور اس نے اُن کے ازلی وابدی دشمن کی حیثیت اختیار کر لی تھی' اسی طرح یہ مدعیانِ علم وفضل اور حاملانِ دین وشریعت بھی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزاز واکرام پر حسد کی آگ میں جل اُٹھے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوب جاننے اور پہچاننے کے باوجود مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے ہیں اور اس عداوت اور دشمنی میں مشرکین سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے ہیں۔

پانچواں رکوع یہود کو دعوت پر مشتمل ہے اور اُس کی سات آیات اس اعتبار سے انتہائی اہم ہیں کہ اس میں انہیں نہایت بلیغ پیرائے میں آنحضورﷺ اور قرآن پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے' اور دعوت کی مناسبت سے اُسلوب ایسا مؤثر اختیار کیا گیا ہے کہ اگر کسی کے دل میں قبولِ حق کی ذرّہ برابر استعداد بھی موجود ہو تو وہ فوراً تسلیم کر لے اور لبیک کہتا ہوا حاضر ہو جائے۔

چھٹے رکوع کے آغاز سے پندرہویں رکوع کے آغاز تک نو رکوعوں سے زائد پر مشتمل ایک مفصل فردِ قراردادِ جرم ہے جو یہود پر عائد کی گئی' اور جس کی پاداش میں اُن سے وراثتِ ابراہیمی سلب کر لی گئی اور امامت الناس کا منصب چھین لیا گیا۔ اس مفصل فردِ قراردادِ جرم میں ان کی تاریخ کے بعض اہم واقعات کا بیان بھی ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے اس نعمت کی قدر ابتدا ہی سے نہ کی اور اس منصب کی ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہی ضائع کر دیا۔ اور ان جملہ اِعتقادی اور عملی و اخلاقی گمراہیوں کی تفصیل بھی ہے جن میں اپنی تاریخ کے مختلف اَدوار میں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے۔ اس حصے کا ایک خاص پہلو اور بھی ہے جو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے' یعنی اس میں نہ صرف یہ کہ ماضی کی تاریخ بیان ہوئی ہے بلکہ علامہ اقبال کے الفاظ میں: ''آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر'' بھی موجود ہے۔ اس لیے کہ آنحضورﷺ کے اس قول کے مصداق کہ:

((لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِىْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ))[1]

''میری اُمت پر بھی وہ سب کچھ وارد ہو گا جو بنی اسرائیل پر ہوا' بالکل اسی طرح جس طرح ایک جوتا دوسرے جوتے سے مشابہ ہوتا ہے۔''

بعد میں خود اُمتِ مسلمہ میں وہ ساری اخلاقی و عملی اور اعتقادی یا نظری و فکری گمراہیاں پیدا ہو کر رہیں' جیسے بجائے ایمان اور عمل کے مدارِ نجات نسلی یا گروہی نسبتوں کو قرار دے دینا' جس کا ذکر ہے آیت ۶۲ میں' یا آخرت کی جواب دہی کے اِحساس کو زائل کر دینا' اپنی امتیازی حیثیت اور اللہ کے چہیتے اور اُس کے رسولوں کے نام لیوا ہونے کے زعم یا کسی سفارش کی

(۱) سنن الترمذی' کتاب الایمان علی رسول اللہ' باب ما جاء فی افتراق هذه الامة

اُمید موہوم اور امداد کی غلط توقع کی بنا پر جیسے کہ واضح کیا گیا آیات ۴۸ و ۱۲۳ میں' یا عمل کے بجائے تمناؤں کے سہارے جینا' جس کا ذکر ہے آیت ۸۰ میں' اور جدوجہد اور سعی وعمل کے بجائے اصل دلچسپی رکھنا عملیات یا سحر و کہانت اور ٹونوں ٹوٹکوں سے' جس کا ذکر ہے آیت ۱۰۲ میں' یا کتابِ الٰہی کو بھی یا تو بالکل پیٹھ پیچھے پھینک دینا اور کلیتہً نظر انداز کر دینا' جس کا ذکر ہے آیت ۱۰۱ میں' یا اُس کے حصے بخرے کر دینا کہ شریعت کا ایک جزو تو واجب العمل قرار پائے اور دوسرے جزو کو حیلوں بہانوں سے ساقط العمل کر دیا جائے' جس کا حد درجہ زور دار تہدیدی انداز میں ذکر ہے آیت ۸۵ میں' اور نتیجتاً مبتلا اور مغلوب ہو جانا حیاتِ ارضی کی محبت میں' اور خواہاں ہونا طولِ حیاتِ دُنیوی کا' جس کا ذکر ہے نہایت مذمت آمیز انداز میں آیات ۹۴ تا ۹۶ میں' اور بٹ جانا فرقوں اور گروہوں میں' جن کی ساری مساعی وقف ہو ایک دوسرے کی تکذیب اور تردید ہی میں' جس کی جانب اشارہ کیا گیا آیات ۱۱۱ تا ۱۱۳ میں ----اور ان سب کی پاداش میں باطنی طور پر مبتلا ہو جانا اُس قساوتِ قلبی میں جس کا حد درجہ یاس آمیز انداز میں ذکر کیا گیا آیت ۷۴ میں اور ظاہری طور پر ہدف بن جانا اللہ کے غضب کا اور مبتلا ہونا ذلت و مسکنت اور محکومی و رُسوائی میں' جس کا انتہائی عبرت انگیز الفاظ میں ذکر ہوا آیت ۶۱ میں! فَاعۡتَبِرُوۡا یَا اُولِی الۡاَبۡصَارِ!

آخری حصے کے پہلے دو رکوعوں یعنی پندرہویں اور سولہویں رکوعوں میں پہلے بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں کے جدِ امجد یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کو عطا کیے جانے والے منصب امامت الناس کا ذکر ہے۔ پھر تعمیر کعبہ اور اُس دعا کا ذکر ہے جو اُس کی تعمیر کے وقت معمارانِ حرم یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے لبوں پر جاری تھی:

﴿رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَیُزَكِّیۡهِمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۲۹)

''اے ربّ ہمارے! ہماری نسل میں سے ایک رسول اٹھائیو! جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور اُن کا تزکیہ کرے۔''

اس کے بعد ایک بار پھر یہود کو نہایت مؤثر انداز میں زجر و توبیخ بھی کی گئی ----اور آخر

میں دو رکوعوں یعنی سترہویں اور اٹھارہویں رکوعوں میں اعلان کر دیا گیا کہ یہود ہمیشہ کے لیے امامت الناس اور حاملِ کتابِ الٰہی و شریعتِ خداوندی ہونے سے محروم کر دیے گئے اور اب ''شہادت علی الناس'' کا یہ منصب اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو عطا فرما دیا گیا۔ اور اس عظیم تبدیلی کی علامت کے طور پر ابدالآباد تک اہل ایمان و یقین اور اربابِ عرفان و آگہی کا قبلہ بنی اسرائیل کی عظمت و سطوتِ پارینہ کی یادگار اور اُن کے دینی و مذہبی مرکز یعنی بیت المقدس کے بجائے اس گھر کو قرار دے دیا گیا جو: ﴿اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ﴾ کا مصداق بھی ہے اور ﴿مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ﴾ کا بھی، اور جس کی تعمیر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی شرکت کی تھی اور جسے اب اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔

اس حصے میں اس اہم تبدیلی کے اعلان کے ساتھ ہی اُمت مسلمہ کو متنبہ کر دیا گیا کہ اس منصب پر فائز ہونا جہاں ایک بہت بڑا اعزاز ہے وہیں ایک بھاری ذمہ داری اور نازک فرض کی حیثیت بھی رکھتا ہے، جس کے لیے وہ اللہ کے یہاں مسئول ہوں گے۔ اس لیے کہ ان کی غرضِ تاسیس یہ ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے دین کی گواہی اُن کے سامنے قولاً و عملاً دی اور اس میں نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا لحاظ کیا نہ مخالفت کرنے والے کی مخالفت کا، اور اس طرح اللہ کی حجت ان پر قائم کر دی، اسی طرح اب ان کی ذمہ داری ہے کہ اس دین کی گواہی دیں اپنے قول سے بھی اور عمل سے بھی، انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی، پوری دنیا اور تمام نوعِ انسانی کے سامنے، اور اللہ کی حجت قائم کریں اُن پر ---اور ساتھ ہی واضح کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اصل میں اسی دُعائے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا ظہور ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اور اِن کا عملی طریق کار بھی وہی ہے جس کا ذکر اس دُعا میں کیا گیا تھا، یعنی: ''اے مسلمانو! ہم نے بھیج دیا ہے تم میں اپنا رسول خود تم ہی میں سے، جو پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیات اور تزکیہ کرتا ہے تمہارا اور تعلیم دیتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت کی......'' اور اب تمہارا کام یہ ہے کہ ہمارے اس احسان کو یاد رکھو اور

اس کا حق ادا کرو' یعنی یہ کہ کتاب وحکمت کے وارث ہونے کی ذمہ داریوں کو ادا کرو۔

۞۞۞

تقریر نمبر ۲

سورۃ البقرۃ کا نصف ثانی جو انیسویں رکوع کے آغاز بلکہ اٹھارہویں رکوع کے اِختتام سے شروع ہوتا ہے اور آخر سورت تک پھیلا ہوا ہے اور جس میں تمام تر خطاب اُمت مسلمہ سے بحیثیت اُمت مسلمہ ہوا ہے' ترتیب مضامین کے اعتبار سے ایک ایسی رَسّی کے مانند ہے جو دو لڑیوں کو بٹ کر بنائی گئی ہو اور اُن میں سے ہر لڑی بھی دو دو ڈوریوں سے بٹی ہوئی ہو۔

ان دو لڑیوں میں سے ایک دین وشریعت کی تفصیلات پر مشتمل ہے اور دوسری اُس کے غلبے کی سعی وجہد کی ترغیب وتشویق پر! ---- پھر دین وشریعت والی لڑی کی بھی دو ڈوریاں ہیں' یعنی ایک عقائد وایمانیات اور دین کے فلسفہ وحکمت کی تفصیل پر مشتمل ہے اور دوسری عبادات واعمال' اخلاق وآداب' اوامر ونواہی اور حلال وحرام کی تفصیلات یعنی احکامِ شریعت پر مشتمل ہے۔ اور غلبۂ دین کی سعی وجہد کی بھی دو شاخیں ہیں۔ ایک وہ جو اِنفاقِ مال یا سرمایہ و دولت کے صَرف سے عبارت ہے اور دوسری وہ جو بذلِ نفس یعنی جسمانی قوتوں کے کھپانے اور بالآخر جان کی بازی کھیل جانے سے عبارت ہے۔

اس تمہید کے بعد ذرا ہر موضوع کا علیحدہ علیحدہ اِجمالی جائزہ لے لیجیے!

عقائد وایمانیات

عقائد وایمانیات کے ذیل میں سب سے پہلے آیۃ الکرسی کا ذکر مناسب ہے' جسے آنحضورﷺ نے قرآن مجید کی عظیم ترین آیت قرار دیا ہے اور اس میں ہرگز کوئی شبہ نہیں کہ توحید فی الصفات کے ضمن میں اس آیۂ مبارکہ کو وہی مقام حاصل ہے جو توحید فی الذات کے ذیل میں سورۃ الاخلاص کو! ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗۤ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُہٗ حِفْظُھُمَا ۚ وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾ ﴾ (البقرۃ)

''اللہ (ہی معبودِ برحق ہے) اس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ زندہ ہے سب کا قائم رکھنے والا۔ نہ اُس کو اُونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند۔ جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اُسی کی ملکیت ہے۔ کون ہے جو اُس کے حضور اُس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ اُن کے سامنے ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے۔ اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اس کے جو وہ چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے' اور ان کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں' اور وہ بلند و عظیم ہے۔''

توحید کے ضمن میں سورۃ البقرۃ کا بیسواں رکوع بھی بہت اہمیت کا حامل ہے' جس میں توحید کی آیاتِ آفاقی کا ذکر بھی تفصیل سے ہے اور توحید کا اصل حاصل اور لب لباب بھی بیان کر دیا گیا ہے' یعنی یہ کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات ہی جملہ موجودات سے محبوب تر اور عزیز تر ہو جائے اور اللہ ہی انسان کا مطلوب و مقصودِ اصلی بن جائے۔

فلسفہ و حکمت دین کے اعتبار سے سورۃ البقرۃ کے بائیسویں رکوع کی پہلی آیت یعنی آیۃ البرّ بھی قرآن حکیم کی عظیم ترین آیات میں سے ہے جس میں بر و تقویٰ کے ایک غلط تصور کی نفی کر کے ان کی اصل حقیقت واضح کر دی گئی ہے۔ چنانچہ ان کی رُوح کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے' اور اُن کے مظاہر کی تفصیل بھی ان کی نسبتِ باہمی کی وضاحت کے ساتھ کر دی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنا رُخ مشرق و مغرب کی طرف پھیر دو' بلکہ اصل نیکی (اس کی ہے) جو ایمان لایا اللہ پر' قیامت کے دن پر' فرشتوں پر' کتابوں پر' انبیاء پر' اور دیا اُس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو' مسافر

کو' سائلوں کو اور گلو خلاصی کرانے کے لیے' اور قائم کی اُس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ
'اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جبکہ کوئی معاہدہ کر لیں۔ اور خصوصاً صبر کرنے
والے فقر و فاقہ پر اور مصائب و تکالیف پر اور جنگ و قتال کے وقت۔ یہی لوگ ہیں
حقیقتاً راست باز اور یہی ہیں واقعتہً متقی و پرہیز گار۔''

ایمان کے ذیل میں اُمورِ ایمانیہ کی تفصیل آیۂ برّ میں بھی ضمناً آ گئی ہے اور آیت ۲۸۵ میں بھی' جو (صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق) آخری آیت یعنی آیت ۲۸۶ کے ساتھ ہی آنحضور ﷺ کو معراج میں عطا ہوئی تھی۔

احکامِ شریعت

جیسے کہ سب جانتے ہیں' شریعتِ اسلامی بھی دو اَجزاء پر مشتمل ہے' یعنی ایک حقوق اللہ یا عبادات اور دوسرے حقوق العباد یا معاملات۔

عبادات

عبادات کے ضمن میں جہاں تک نماز کے ذکر کا تعلق ہے تو وہ تو تانے بانے کے مانند پوری سورت ہی میں بُنا ہوا ہے۔ چنانچہ اس جزوِ ثانی کا آغاز ہی اس ہدایت سے ہوا کہ:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ﴾ (البقرة:۱۵۳)

''اے اہل ایمان! مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے۔''

اور پھر آیات ۲۳۸' ۲۳۹ میں تاکید کی گئی کہ نماز کی پوری حفاظت کرو۔ حتیٰ کہ اگر خوف کی حالت ہو تو بھی' خواہ پیدل چلتے ہوئے' خواہ سواری کی حالت میں' بہر حال کسی صورت میں بھی اس سے غفلت نہ برتو! رہا صلوٰۃ اور زکوٰۃ دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر تو وہ پورے قرآن کے مانند اس صورت میں بھی پانچ بار آیا ہے جن میں سے ایک بار نصف اوّل میں یہود سے خطاب کے ضمن میں آیا تھا' اور چار بار نصف ثانی میں مسلمانوں سے خطاب کے ضمن میں آیا ہے' یعنی آیات ۸۳' ۱۱۰' ۱۷۷ اور ۲۷۷ میں۔

روزے کی حکمت اور احکام کے ضمن میں تو قرآن مجید میں پوری کی پوری بحث سورۃ

البقرۃ کے ایک ہی مقام پر یعنی تیئیسویں رکوع میں آیات ۱۸۳ سے ۱۸۷ تک آ گئی ہے۔ یعنی حکمت صوم کے ضمن میں اس کی وضاحت بھی کہ روزے سے اصل مقصود حصولِ تقویٰ ہے۔ اس کی صراحت بھی کہ اس عبادت کے لیے رمضان کا مہینہ اس لیے مقرر کیا گیا کہ اس میں قرآن کے نزول کا آغاز ہوا تھا۔ اس کی نشاندہی بھی کہ روزے کا اصل حاصل حلاوتِ دُعا اور لذتِ مناجات ہے اور احکامِ صوم کی پوری تفصیل بھی اُن کے ارتقائی مراحل کے تذکرے سمیت! یعنی وہ ابتدائی حکم بھی جس کی رُو سے روزے کا وُجوب علی التخییر قرار پاتا ہے اور وہ آخری حکم بھی جس کی رُو سے روزے کی فرضیت علی التعیین ہوگئی!

☆ اسی طرح حج اور اس کے مناسک و احکام کے ضمن میں بھی اس سورۂ مبارکہ کی آیات ۱۹۶ تا ۲۰۳ کو حد درجہ اہمیت حاصل ہے، جن میں مناسک حج کے ضمن میں تمام ضروری ہدایات آ گئی ہیں۔ یاد ہوگا کہ ایک رُکنِ حج یعنی ''سعی بین الصفا والمروۃ'' کا ذکر اس سورۂ مبارکہ کے نصف ثانی کے بالکل آغاز میں آیت ۱۵۸ میں کر دیا گیا تھا۔

معاملات

جہاں تک معاملاتِ انسانی کا تعلق ہے، اس سورۂ مبارکہ کو شریعت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں وہی مقام حاصل ہے جو کسی عمارت کی تعمیر کے ضمن میں اس کے نقشے کے ابتدائی خاکے (Blue Print) کو حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ زندگی کے تمام پہلوؤں سے متعلق ابتدائی احکام اس سورت میں دیے گئے ہیں اور ان سے شریعتِ اسلامی کا ابتدائی خاکہ تیار ہوگیا ہے۔ بعد میں زیادہ تو سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ، اور کسی قدر سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب وغیرہا میں تکمیلی احکام نازل ہوئے، جن سے اس عمارت کا اتمام و اکمال ہوگیا، بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے......''

چنانچہ سب سے پہلے آیات ۱۶۸ تا ۱۷۳ میں کھانے پینے کی چیزوں میں حلت و

حرمت کا ضابطہ بیان کیا گیا‘ جس کے ضمن میں تکمیلی احکام سورۃ المائدۃ کے پہلے رکوع میں آئے! پھر آیات ۱۷۸‘۱۷۹ میں قتل کے ضمن میں قصاص اور دیت کے احکام بیان ہوئے۔ پھر آیات ۱۸۰ تا ۱۸۲ میں وصیت کا حکم دیا گیا جو گویا اسلام کے قانونِ وراثت کی تمہید تھا‘ جو بعد میں سورۃ النساء میں نازل ہوا۔ پھر آیت ۱۸۸ میں حرام خوری اور بالخصوص رشوت کی ممانعت کی گئی۔ پھر آیت ۲۱۹ میں شراب اور جوئے کی حرمت کی تمہید باندھی گئی‘ جس کی تکمیل سورۃ المائدۃ میں ہوئی۔ پھر آیت ۲۲۰ میں یتیموں کے حقوق کی طرف توجہ دلائی گئی۔ یہ بھی گویا تمہید ہے اس تفصیلی ہدایت کی جو سورۃ النساء کے رکوع اوّل میں آئی ہے۔ پھر اوّلاً آیت ۲۲۱ میں مشرکہ عورتوں سے نکاح کی ممانعت وارد ہوئی اور اس کے بعد آیات ۲۳۳ تا ۲۴۲ میں نکاح‘ طلاق‘ ایلاء‘ خلع‘ رضاعت‘ بیویوں کا نان ونفقہ‘ بیوہ کے حقوق‘ مہر اور ازدواجی زندگی کے دوسرے بہت سے معاملات سے متعلق تفصیلی احکام دیے گئے‘ جن پر بعد میں مزید اضافوں سے اسلام کے عائلی نظام کا حسین وجمیل اور پاک وصاف قصر تعمیر ہوا۔

پھر آخری حصے میں‘ جو ترتیب نزولی کے اعتبار سے مدنی دَور کے آخر سے تعلق رکھتا ہے‘ اوّلاً آیات ۲۷۵ تا ۲۸۱ میں سُود کی حرمت کا بیان نہایت سخت الفاظ میں ہوا۔ ثانیاً آیت ۲۸۲ میں قرض اور اس سلسلے کی لکھت پڑھت اور گواہی و شہادت کے قانون کی تفصیل آئی‘ اور اسی کے ضمیمے کے طور پر آیت ۲۸۳ میں رہن کا ضابطہ بیان ہوا اور اس طرح‘ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے‘ شریعت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا ابتدائی خاکہ تیار ہو گیا۔

جہاد فی سبیل اللہ

سورۂ بقرہ کے نصف ثانی کے مضامین کی دوسری لڑی دینِ حق کے غلبے کی سعی و جہد اور اس کے لیے ترغیب وتشویق پر مشتمل ہے۔ اور اس کے بھی‘ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے‘ دو جزو ہیں۔

۱) ایک جہاد بالمال یا انفاق فی سبیل اللہ۔ یعنی اللہ کے پیغام کی نشر واشاعت‘ قرآن مجید کے علم وحکمت کی تعلیم وتشہیر اور اللہ کے دین کے غلبے کی جدوجہد میں مال صرف کرنا‘ جس کی

تاکید ویسے تو اس سورۂ مبارکہ کے نصف ثانی میں از اوّل تا آخر رچی بسی ہوئی ہے۔ چنانچہ آیات ۱۹۵‘ ۲۱۵‘ ۲۱۹‘ ۲۴۵ اور ۲۵۴ میں بتکرار و اِعادہ اس کا ذکر موجود ہے۔ لیکن آیات ۲۶۱ تا ۲۷۴ یعنی رکوع ۳۶ اور ۳۷ (اور رکوع ۳۸ کی پہلی آیت) تو اس موضوع پر پورے قرآن مجید میں ''ذُرْوَۃُ السَّنَامِ'' یعنی چوٹی یا نقطۂ عروج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۲) دوسرا قتال فی سبیل اللہ‘ یعنی اللہ کے دین کے غلبے کے لیے کفار سے جنگ‘ جس کا منتہائے مقصود ہے درجۂ شہادت‘ بقول علامہ اقبال:

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

چنانچہ سورۃ البقرۃ کے نصف ثانی کا آغاز ہی اس درجۂ شہادت اور اس کے مرتبہ ومنزلت کے بیان سے ہوا جو آیات ۱۵۴ تا ۱۵۷ پر پھیلا ہوا ہے‘ یعنی ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو‘ بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم محسوس نہیں کرتے۔ بے شک ہم تمہارا امتحان لیں گے‘ کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں‘ جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور ان ثابت قدموں کو خوشخبری سنا دو۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور یقیناً اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اُن کے ربّ کی عنایتیں ہیں اور رحمت‘ اور یہی لوگ راہ یاب ہونے والے ہیں۔''

پھر باقاعدہ حکمِ قتال آیا جو آیات ۱۹۰ تا ۱۹۴ پر پھیلا ہوا ہے۔ گویا ترتیب مصحف میں حج کے احکام سے متصلاً قبل ہے‘ جس سے اس امر کی جانب رہنمائی ملتی ہے کہ اس کا اوّلین ہدف مقاماتِ حج یعنی حرم کو مشرکین کے تسلط سے نجات دلانا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ تصریح بھی کر دی گئی کہ قتال کا سلسلہ جاری رہے گا تا آنکہ فتنہ وفساد بالکل فرو ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے: ﴿وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ﴾ (آیت ۱۹۳) گویا قتال فی سبیل اللہ کا آخری ہدف غلبۂ دینِ حق ہے۔

پھر آیت ۲۱۴ میں قتال سے جی چرانے والوں کو تنبیہہ کی گئی کہ کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ

جنت میں داخلہ مل جائے گا‘ بغیر اللہ کی راہ میں مصائب جھیلے اور تکالیف برداشت کیے؟ حالانکہ تم سے پہلے اہل ایمان کا ہم خوب ٹھوک بجا کر امتحان لیتے رہے ہیں!

پھر آیات ۲۱۶ تا ۲۱۸ میں قتال فی سبیل اللہ کی فرضیت ومشروعیت کی تصریح کی گئی اور تھوڑی دور آگے چل کر آیت ۲۴۴ میں نہ صرف یہ کہ اس کا پرزور اِعادہ کیا گیا بلکہ آیات ۲۴۶ تا ۲۵۲ میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے اُن واقعات کا ذکر ہوا جن میں مشرکین اور کفار سے قتال کے نتیجے میں تاریخی اعتبار سے یہود کی عظمت وسطوت کے دَور کا آغاز ہوا‘ یعنی وہ جنگ جو طالوت اور جالوت کے مابین ہوئی اور جس کے بعد حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام کی پُرشکوہ بادشاہت شروع ہوئی۔ یہ تفصیلی بیان درحقیقت غزوۂ بدر کی تمہید تھا جس سے خود مسلمانوں کی سطوت وشوکت اور دینِ حق کے غلبے کے دَور کا آغاز ہوا‘ جس کا نقطۂ عروج دورِ خلافت راشدہ ہے۔

اور پھر اس سورۂ مبارکہ کا اِختتام ہوا اس عظیم دُعا پر جو شہادت علی الناس کی نازک ذمہ داری کی ادائیگی اور جہاد وقتال فی سبیل اللہ کے کٹھن مراحل میں اہل ایمان کے لیے سرمایۂ اطمینان وسکون بنتی ہے اور جس کا خاتمہ ہوتا ہے کفار کے بالمقابل اللہ سے امداد ونصرت کی اِستدعا پر‘ اور جو آنحضور ﷺ کو عطا فرمائی گئی تھی شب معراج میں اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لیے ہدیۂ ربانی کے طور پر۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾﴾

’’اے ہمارے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہم سے مؤاخذہ نہ فرمانا۔ اے ہمارے پروردگار! ہمارے اُوپر اس طرح کا کوئی بار نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے گزرے‘ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ لاد جس کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو‘ اور ہمیں معاف کر‘ ہمیں بخش دے

اور ہم پر رحم فرما' تو ہمارا مولا ہے' پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔''

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

تقریر نمبر۳

سورۂ آلِ عمران

ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے سورۃ البقرۃ کے بعد سورۃ الانفال کا نمبر ہے' اس لیے کہ وہ کُل کی کُل غزوۂ بدر کے فوراً بعد نازل ہوئی۔ لیکن ترتیبِ مصحف میں سورۃ الانفال کو سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف کے بعد اور سورۃ التوبۃ سے قبل رکھا گیا ہے' جس کی حکمت پر گفتگو اِن شاء اللہ سورۃ الانفال ہی کے ضمن میں ہوگی۔ بہرحال مصحف میں سورۃ البقرۃ کے بعد سورۂ آلِ عمران ہے' جس کے بارے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ ہر اعتبار سے سورۃ البقرۃ کا جوڑا معلوم ہوتی ہے۔

چنانچہ یہ بھی مضامین کے اعتبار سے سورۃ البقرۃ کی طرح دو بالکل مساوی حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصے میں روئے سخن اہل کتاب اور ان میں سے بھی بالخصوص نصاریٰ کی جانب ہے اور دوسرے میں خطاب کا رُخ براہِ راست اُمت مسلمہ کی طرف ہے۔

پھر اُس کا نصف اوّل بھی ٹھیک سورۃ البقرۃ کے مانند تین اجزاء ہی پر مشتمل ہے' یعنی جزو اوّل جو آیات ۱ تا ۳۲ پر مشتمل ہے' جو غزوۂ بدر کے فوراً بعد نازل ہوا اور جسے اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ سے خطاب کی تمہید قرار دیا جا سکتا ہے' جزوِ ثانی جو آیات ۳۳ تا ۶۳ پر مشتمل ہے اور صحیح روایات کے مطابق ۹ ھ میں وفد نجران کی آمد کے موقع پر نازل ہوا۔ جس میں نصاریٰ سے براہِ راست خطاب فرمایا گیا اور اُن کے عقیدۂ اُلوہیتِ مسیح کی بھرپور تردید کی گئی' اور جزوِ ثالث جو آیات ۶۴ تا ۹۹ پر مشتمل ہے جس کا زمانۂ نزول غزوۂ اُحد سے متصلاً قبل معلوم ہوتا ہے اور جس میں خطاب کا رُخ اہل کتاب کے دونوں گروہوں کی جانب

ہے‘یعنی یہود کی جانب بھی اور نصاریٰ کی جانب بھی اور دونوں ہی کو بالکل سورۃ البقرۃ کے انداز میں دعوت بھی دی گئی ہے اور ملامت بھی کی گئی ہے۔

اسی طرح اس سورۂ مبارکہ کا نصف ثانی بھی تین اجزاء پر منقسم ہے۔ جزوِاوّل جو آیات ۱۰۰ تا ۱۲۰ پر مشتمل ہے‘ جس کا زمانۂ نزول نصف اوّل کے جزوِثالث کے ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے اور جس میں اُمت مسلمہ سے عمومی خطاب فرمایا گیا ہے اور انہیں ان کے مقام ومرتبہ سے آ گاہی بخشنے کے ساتھ ساتھ اصولی ہدایات دی گئی ہیں اور بالخصوص اہل کتاب کے ہتھکنڈوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ جزوِثانی جو آیات ۱۲۱ تا ۱۸۰ پر مشتمل ہے اور صحیح روایات کے مطابق غزوۂ اُحد کے فوراً بعد نازل ہوا‘ جس میں غزوۂ اُحد کے حالات وواقعات اور اُس کے فوراً بعد پیدا ہونے والی سنگین صورتِ حال پر بھرپور تبصرہ بھی کیا گیا ہے اور اس کے سلسلے میں اہل ایمان کو خصوصی ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ اور جزوِثالث جو آیات ۱۸۱ تا ۲۰۰ پر مشتمل ہے اور خاتمۂ کلام کی حیثیت رکھتا ہے اور غالباً غزوۂ اُحد سے قبل نازل ہوا۔ واللہ اعلم!

۞۞۞

اس تجزیے کے بعد آیئے کہ ہر حصے کے اہم مضامین کا جائزہ لے لیں!

(ا) سورۃ البقرۃ کی طرح سورۂ آلِ عمران کا آغاز بھی حروفِ مقطعات الٓمّٓ سے ہوتا ہے اور اس کے پہلے رکوع میں اوّلاً قرآن مجید کی عظمت وجلالتِ شان کا بیان ہے‘ اس مزید وضاحت کے ساتھ کہ یہ کوئی نئی یا انوکھی کتاب نہیں‘ بلکہ کتب سماویہ کے اُس عظیم سلسلے کی آخری وجامع اور مکمل ومحفوظ کڑی ہے جس میں تورات اور انجیل بھی شامل ہیں۔ پھر سورۃ البقرۃ کے پہلے رکوع ہی کے مانند یہاں بھی دو گروہوں کا ذکر ہوا۔ ایک وہ طالبانِ ہدایت جو اس کتابِ الٰہی سے صحیح اِستفادہ کرنے والے ہیں اور دوسرے وہ جن کے قلوب میں کجی ہوتی ہے اور جو فتنے کے متلاشی ہوتے ہیں۔ نتیجتاً خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں---اس ضمن میں اس اہم حقیقت کی جانب رہنمائی عطا فرمائی گئی کہ

کتابِ الٰہی دو قسم کی آیات پر مشتمل ہے۔ ایک آیاتِ محکمات جن کا مفہوم و مدلول بالکل واضح اور ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے اور دوسری آیاتِ متشابہات' جن کے اصل مراد و معنی کی تعیین میں اِشتباہ پیش آ سکتا ہے۔ جن لوگوں کے دلوں میں کجی اور نیت میں خلل ہوتا ہے اور جو بجائے ہدایت کے فتنے کے طالب ہوتے ہیں وہ آیاتِ متشابہات کی کھود کرید میں مصروف رہتے ہیں' اور جن طالبانِ ہدایت کو اللہ تعالیٰ رسوخ فی العلم عطا فرما دیتا ہے اُن کی اصل دلچسپی آیاتِ محکمات سے ہوتی ہے' اور وہ آیاتِ متشابہات کے ضمن میں اِجمالی ایمان پر اکتفا کرتے ہوئے اللہ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ:

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸﴾

''اے ہمارے ربّ! ہمارے دلوں کو کجی میں نہ مبتلا کر دیجیو اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت سے سرفراز فرمایا' اور ہمیں عطا فرما اپنے خزانۂ فضل سے رحمتِ خصوصی' یقیناً تو ہی عطا فرمانے والا ہے!''

اس میں ایک لطیف اشارہ ہو گیا نصاریٰ کی گمراہی کی طرف جنہوں نے ''رُوح اللہ'' اور ''كَلِمَةٌ مِّنْهُ'' کے متشابہ الفاظ سے رائی کا پہاڑ بنا ڈالا اور اُلوہیتِ مسیح کا عقیدہ گھڑ لیا۔

جز واوّل کی بقیہ آیات یعنی از ۱۰ تا ۳۲ کے بارے میں قابل اعتماد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پس منظر میں ایک خاص واقعہ ہے' اور وہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر سے واپسی پر آنحضور ﷺ اور آپ کے ساتھی اہل ایمان کا گزر بنی قینقاع کے بازار سے ہوا اور وہاں آپ ﷺ نے یہود کو دعوتی خطبہ ارشاد فرمایا۔ جواب میں یہودِ بنی قینقاع نے انتہائی گستاخانہ انداز میں کہا کہ: ''بدر کی فتح سے دھوکا نہ کھانا! جب ہم سے مقابلے کی نوبت آئی تو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا''۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ چنانچہ ان میں اہل کتاب پر سخت تنقید بھی ہے اور انہیں شدید تہدید و وعید بھی۔ اور ساتھ ہی اہل ایمان کو متنبہ کر دیا گیا ہے کہ ان سے میل جول اور قریبی تعلقات اور دلی دوستی رکھنے سے پرہیز کریں۔

(۲) نصف اوّل کے جزوثانی کا آغاز انبیاء ورُسل علیہم السلام کے عظیم سلسلے کے حوالے سے ہوتا ہے جس میں آدم ونوح اور آل ابراہیم وآلِ عمران کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے گئے۔ اس کے فوراً بعد حضرت مریم سلام علیہا کی والدہ ماجدہ کا ذکر ہوا اور پھر خود حضرت مریمؑ اور اُن کی نیکی وعبادت گزاری اور طہارت و پاک دامنی کی تفصیلات بیان ہوئیں اور پھر اُسی کے حوالے سے حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اوراس کی اجابت وقبولیت اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر ہوا جو بجائے خود ایک خرقِ عادت بات تھی' اس لیے کہ حضرت زکریاؑ بھی اُس وقت بہت ضعیف ہو چکے تھے اور اُن کی اہلیہ یعنی حضرت یحییٰؑ کی والدہ بھی نہایت بوڑھی تھیں اور تمام عمر بانجھ رہی تھیں۔ یہ گویا تمہید ہے حضرت مسیح علیہ السلام کی خرقِ عادت ولادت کے ذکر کی۔ چنانچہ پھر بیان کا رُخ حضرت مریم اور حضرت مسیح علیہما السلام کی جانب مڑ گیا اور اُن کے معجزات اور حالات وواقعات کے ذکر کے بعد اصل حقیقت کو بے نقاب کر دیا گیا کہ حضرت مسیحؑ نہ خود خدا تھے نہ خدا کے بیٹے' بلکہ اللہ کے رسول اوراس کے بندے اور مخلوق تھے۔ اُن کی ولادت ضرور بغیر باپ کے ہوئی اور انہیں معجزات بھی نہایت عظیم عطا کیے گئے' لیکن یہ سب کچھ اللہ کی قدرت سے ہے نہ کہ کسی اور کے ارادہ واختیار سے۔ اگر حضرت یحییٰؑ کی خلافِ عادت ولادت ان کی اُلوہیت کی دلیل نہیں تو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت میں طبعی قانون اگر تھوڑا سا مزید ٹوٹتا نظر آتا ہے تو آخر اس سے ان کا خدا یا خدائی میں شریک ہونا کیسے لازم آ گیا؟ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' یہ عظیم خطبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ۹ھ میں نجران کے عیسائیوں کے وفد کی آمد کے موقع پر نازل ہوا تھا۔ چنانچہ اس کے آخر میں انہیں مباہلے کا چیلنج بھی دے دیا گیا' ہے اور روایاتِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ ایمان سے تو محروم ہی لوٹ گئے لیکن مباہلہ کا چیلنج قبول کرنے کی جرأت نہ کر سکے!

(۳) نصف اوّل کے جزوثالث میں' جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا تھا' اہل کتاب کو دعوت بھی ہے اور ملامت بھی۔ چنانچہ اس کا آغاز اِس عظیم آیت سے ہوتا ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ

اللّٰہِ ؕ﴾ (آیت ۶۴)

”(اے نبی!) کہہ دو: اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے مابین مشترک ہے' (یعنی) یہ کہ ہم بندگی نہ کریں اللہ کے سوا کسی کی' اور شریک نہ کریں اس کے ساتھ کسی کو اور ہم میں سے کوئی نہ بنا لے اللہ کے سوا دوسروں کو ربّ......“

اس اُصولی اِشتراک کے بعد دعوت کے ضمن میں بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں کے مشترک جدّ امجد کا ذکر کیا گیا اور اُن کے بارے میں فرمایا گیا کہ نہ وہ یہودی تھے نہ نصرانی' بلکہ ان کا دین بھی وہی اسلام تھا جس کی دعوت نبی اُمی ﷺ دے رہے ہیں۔ اس ضمن میں سورۃ البقرۃ کے مانند یہاں بھی خانۂ کعبہ کا ذکر بھی کیا گیا کہ خدائے واحد کی پرستش کے لیے روئے ارضی پر تعمیر کیا جانے والا پہلا گھر وہی ہے جس کی تولیت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور بنی اسمٰعیل کو عطا کی گئی۔

اس دعوت کے ساتھ ساتھ اُن کی اخلاقی و عملی اور فکری و اعتقادی گمراہیوں پر تنقید بھی کی گئی' اور گویا سورۃ البقرۃ میں جو فردِ قرار دادِ جرم تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی تھی اُس کا خلاصہ دوبارہ سامنے رکھ دیا گیا۔

(۴) نصف ثانی کے جزو اوّل میں سب سے پہلے مسلمانوں کو خبردار کیا گیا کہ اگر وہ اپنی سادہ لوحی کے باعث اہل کتاب کے پروپیگنڈے سے متأثر ہو گئے تو وہ انہیں اسلام سے واپس کفر کی جانب پھیر لے جائیں گے۔

پھر تین بنیادی ہدایتیں دی گئیں۔ ایک یہ کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس سے تقویٰ کا حق ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو۔ صحیح روایات کی رُو سے اس کی وضاحت آنحضور ﷺ نے فرما دی کہ اللہ کی رسّی سے مراد اللہ کی کتاب ہے' اور تیسرے یہ کہ تفرقہ و اختلاف کو راہ نہ دو اور متحد و متفق رہو۔

پھر مسلمانوں کو اُن کے فرضِ منصبی سے آگاہ کیا گیا کہ: ”تم وہ بہترین اُمت ہو جسے دنیا والوں کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ (تمہارا کام یہ ہے کہ) نیکی کا حکم دو' بدی سے روکو اور

اللہ پر (اور بھروسہ) رکھو!''

یہ گویا وہی مضمون ہے جو سورۃ البقرۃ میں اُمت مسلمہ کی غرضِ تاسیس کی بحث کے ضمن میں ''شہادت علی الناس'' کی اصطلاح کے ذریعے بیان کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ عملی ہدایت بھی دے دی گئی کہ اگر خدانخواستہ کبھی اُمت بحیثیت مجموعی اس فریضے سے غفلت برتنے لگے تب بھی اُمتِ مسلمہ میں کم از کم ایک جماعت تو ضرور ایسی رہنی چاہیے جو اسے اپنا مقصد زندگی اور فریضۂ حیات بنا لے۔

(۵) نصفِ ثانی کے دوسرے جزو میں غزوۂ اُحد کے حالات و واقعات پر تفصیلی تبصرہ ہے اور بالخصوص ان کمزوریوں کو نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے جو دعوتِ اسلامی کے اس اہم اور نازک مرحلے پر مسلمانوں کی بعض جماعتوں کی جانب سے ظاہر ہوئیں' اور جن کے نتیجے میں فتح عارضی طور پر شکست میں تبدیل ہوگئی اور نبی اکرم ﷺ بھی زخمی ہوئے اور ستر مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ اس سلسلہ کی اہم ترین آیت ۱۵۲ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

> ''اور اللہ نے تو تم سے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا جب تم انہیں اس کی تائید ونصرت کے طفیل تہِ تیغ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ تم نے (خود ہی) ڈھیلے پن کا مظاہرہ کیا اور حکم کے بارے میں جھگڑا کیا اور نافرمانی کا ارتکاب کیا اس کے بعد کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز (یعنی فتح یا مالِ غنیمت) دکھا دی جو تمہیں محبوب ہے۔ تم میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اصلاً دنیا کے طالب ہیں اور وہ بھی ہیں جو آخرت کے طلب گار ہیں۔ چنانچہ اللہ نے تمہارا رُخ اُن کی جانب سے موڑ دیا تاکہ تمہیں آزمائش کی بھٹی میں تپائے' اور (بالآخر) تمہیں معاف بھی کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ مؤمنین کے حق میں بڑا بخشندہ (ومہربان) ہے۔''

قرآن مجید میں یہ مقام' اہل ایمان کو جو آزمائشیں اللہ کی جانب سے پیش آتی ہیں اُن کے ضمن میں حد درجہ جامع اور اہم ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ واضح کیا گیا کہ اہل ایمان کے لیے اِبتلاء وآزمائش اللہ کی سنتِ ثابتہ ہے اور اس سے کسی کو مفر نہیں۔ دوسری طرف اِس ابتلاء وآزمائش کی حکمت بھی بیان کر دی کہ ان ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کون کتنے پانی

میں ہے ---- اور پانی کہاں کہاں مرتا ہے' تا کہ جماعت اپنی تطہیر اور تمحیص کر لے اور آئندہ کے مراحل کے لیے مزید چاق و چوبند ہو جائے۔ تیسری طرف اس ضمن میں منافقین کا کردار بھی واضح کر دیا گیا تا کہ مسلمان اپنی جماعت کے اس ففتھ کالمسٹ عنصر سے خبر دار ہو جائیں۔

یہ مضامین اس سورۂ مبارکہ میں بہ اِعادہ و تکرار آیات ۱۴۰ تا ۱۴۲' پھر آیات ۱۵۲' ۱۵۴' پھر آیات ۱۶۵ تا ۱۶۸' اور بالآخر نہایت جامع انداز میں آیت ۱۷۹ میں بیان ہوئے ہیں۔ آیت ۱۷۹ کے الفاظ ہیں:

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ﴾

''اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ تمہیں چھوڑ دے اس حال میں جس میں تم ہو (وہ تو جانچ پرکھ جاری رکھے گا) یہاں تک کہ پاک سے ناپاک کو بالکل جدا کر دے!''

اور اس سلسلے میں اِس سورت میں بھی وہ مضمون دوبارہ بیان کر دیا گیا جو اس سے قبل سورۃ البقرۃ کے رکوع ۱۹ میں بیان کیا گیا تھا کہ:

''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھو' وہ زندہ ہیں اور اپنے ربّ کے پاس رزق پا رہے ہیں۔ خود بھی اللہ کی داد و دہش سے فرحاں و شاداں ہیں اور اپنے پیچھے رہ جانے والے صاحبِ ایمان ساتھیوں کے بارے میں بھی خوشیاں منا رہے ہیں کہ اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہے نہ غم!''

(۶) آخری حصہ جو خاتمۂ کلام کی حیثیت رکھتا ہے' دو رُکوعوں پر مشتمل ہے۔

پہلے یعنی سورۃ کے انیسویں رکوع میں ایک بار پھر اس کش مکش کی جانب اشارہ کر دیا گیا جو اہل ایمان اور اہل کتاب کے مابین خصوصاً غزوۂ اُحد کے بعد شدت اختیار کر گئی تھی۔ اس میں اہل کتاب کو اسی تہدید و تنبیہہ اور اہل ایمان کو اُن ہی ہدایات کا اِعادہ کیا گیا جو اِس سے قبل تفصیل سے آ چکی ہیں۔

اور آخری رکوع کی دس آیات وہ ہیں جن کی صحیح احادیث میں حد درجہ فضیلت وارد

ہوئی ہے اور جن سے خصوصی شغف تھا آنحضور ﷺ کو۔ ان میں خلاصہ آ گیا اس اِستدلال کا جو توحید' معاد اور رسالت کے ضمن میں قرآن حکیم کی مکی سورتوں میں تفصیل کے ساتھ وارد ہوا ہے اور ان میں نقشہ کھینچ دیا گیا ہے اہل ایمان کی جان نثاری' سرفروشی' اور غلبۂ دین حق کے لیے گھر بار چھوڑنے' اعزہ واقرباء سے قطع تعلق کرنے اور جہاد وقتال کے معرکے سر کرنے اور جان کی بازی لگا دینے کا۔ اس رکوع میں سورۃ البقرۃ ہی کے مانند ایک عظیم دُعا بھی آ گئی ہے' یعنی:

''اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ (کارخانہ) بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔ تو (اس بات سے) پاک ہے (کہ کوئی عبث کام کرے)' سو تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا! اے ہمارے ربّ! جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا بے شک اس کو تو نے رسوا کر دیا اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں ہو گا۔ اے ہمارے ربّ! یقیناً ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ایمان کی دعوت دیتے ہوئے کہ (لوگو!) اپنے ربّ پر ایمان لاؤ' تو ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے ربّ! ہمارے گناہوں کو بخش دے' ہماری برائیوں کو ہم سے دُور کر دے اور ہمیں موت اپنے وفادار بندوں کے ساتھ دے۔ اے ہمارے ربّ! اور ہمیں بخش وہ کچھ جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانی ہم سے وعدہ فرمایا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو۔ بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا۔''

اور اس کا اِختتام ہوا اس حد درجہ جامع آیت پر کہ:

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا وَرَابِطُوۡا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۲۰۰﴾﴾

''اے اہل ایمان! صبر سے کام لو' مقابلے میں پامردی کا ثبوت دو اور (حفاظت و مدافعت میں) چوکس رہو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو' تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

وَآخِرُ دَعۡوَانَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ

تقریر نمبر ٤

ابتدائی طویل مدنی سورتوں کا دوسرا جوڑا

قرآن مجید کی ابتدائی چار طویل مدنی سورتوں کا دوسرا جوڑا سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ پر مشتمل ہے اور ان دونوں کے مابین سورۃ البقرۃ اور سورۃ آلِ عمران کی طرح صوری ومعنوی دونوں قسم کی مشابہتیں موجود ہیں۔ چنانچہ معنوی مشابہتوں کے ضمن میں دونوں میں ایک طرف تو گویا شریعتِ اسلامی کی تکمیل ہوگئی ہے اور سورۃ النسا میں عائلی اور خاندانی سطح پر اور سورۃ المائدۃ میں معاشرتی وملی سطح پر مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے ضمن میں تکمیلی ہدایات دے دی گئی ہیں۔ اور دوسری طرف یہود ونصاریٰ سے بھی آخری باتیں ہوگئی ہیں ---- اور ظاہری مشابہتوں کے ضمن میں نمایاں ترین چیزیں یہ ہیں کہ دونوں کا آغاز بھی بلاتمہید ہوا ہے، یعنی نہ حروفِ مقطعات آئے ہیں نہ اور کوئی تمہیدی کلام، بلکہ خطاب کا آغاز براہِ راست: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ﴾ اور ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا﴾ کے الفاظ سے ہوگیا ہے۔ اور اسی طرح دونوں کا اِختتام بھی نہایت سادگی سے ہوگیا ہے۔ ایک اور مشابہت جو قدرے غور کرنے پر نظر آتی ہے، یہ ہے کہ اِن دونوں کو سورۃ البقرۃ اور سورۂ آلِ عمران کی طرح نصف نصف میں تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے، بلکہ اِن میں مضامین باہم زیادہ گتھے ہوئے ہیں۔

سورۂ النساء

سورۃ النساء کے مضامین کے تجزیے کے ضمن میں دو باتوں کو پیشگی طور پر جان لینا بہت مفید ہے۔ یعنی ایک یہ کہ اس میں خطاب تین گروہوں سے ہے، ایک اُمت مسلمہ سے بحثیت اُمت مسلمہ، دوسرے اُمت مسلمہ کے ففتھ کالمسٹ عنصر، یعنی منافقین سے اگرچہ ان کو بھی مخاطب: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا﴾ کے پردے ہی میں کیا گیا ہے اور تیسرے اہل

کتاب، یعنی یہود ونصاریٰ سے۔ اور دوسرے یہ کہ ان تینوں سے خطاب ایک ایک بار ہی نہیں ہو گیا ہے بلکہ وقفے وقفے سے ہوا ہے۔ چنانچہ امت مسلمہ کو خطاب پہلے تو آیات ۱ تا ۴۳ میں ہے پھر دوسری بار آیات ۱۲۷ تا ۱۳۵ میں اور پھر آخری آیت یعنی ۱۷۶ میں۔ اسی طرح اہل کتاب سے گفتگو پہلے آیات ۴۴ تا ۵۷ میں آئی ہے اور پھر آیات ۱۵۳ تا ۱۷۵ میں اور منافقین سے خطاب پہلے آیات ۵۸ تا ۱۲۶ میں ہوا ہے اور پھر آیات ۱۳۶ تا ۱۵۳ میں۔

ان حصص کی تعیین کے بعد اب ایک ایک جزو کے مضامین پر بحیثیت مجموعی نگاہ ڈالیے۔

خطاب بہ اُمتِ مسلمہ

اس سورۂ مبارکہ کے وہ حصے جن میں اُمت مسلمہ سے بحیثیت اُمت مسلمہ خطاب فرمایا گیا ہے، بحیثیت مجموعی سورۃ البقرۃ کے نصف ثانی سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان میں شرعی احکام بھی ہیں اور اخلاقی تعلیمات بھی، اور دین کے اساسی عقائد کے مباحث بھی ہیں اور فلسفہ وحکمت کے ذیل میں نہایت جامع تعلیمات بھی۔

احکامِ شرعی

احکامِ شرعی کے ذیل میں اس سورۂ مبارکہ میں سب سے زیادہ تفاصیل عائلی وخاندانی زندگی سے متعلق آئی ہیں۔ اور چونکہ خاندانی اور سماجی زندگی کا نقطۂ آغاز ایک گھر کی آبادی اور ایک مرد اور ایک عورت کا ازدواجی رشتے میں منسلک ہونا ہے لہٰذا سب سے زیادہ تفصیلی احکام اسی کے ضمن میں دیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس کا آغاز ہی اُس آیت سے ہوا ہے جسے گویا اس موضوع کے لیے جامع ترین عنوان کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ آنحضور ﷺ نے بالکل بجا طور پر اسے خطبۂ نکاح کا جزو لاینفک بنالیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

> ”اے لوگو! تقویٰ اختیار کرو اپنے اُس ربّ کا جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی سے بنایا اُس کا جوڑا بھی، اور پھر اُن دونوں سے پھیلا دیا کثیر تعداد میں مردوں اور عورتوں کو۔ اور بچتے رہو اُس (اللہ کی نافرمانی) سے بھی جس کا تم ایک دوسرے کو واسطہ دیا کرتے ہو اور قطعِ رحمی سے بھی۔ اور آگاہ رہو کہ اللہ تمہاری نگرانی

فرما رہا ہے!‘‘

اس جامع ہدایت کے بعد سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق حسب ذیل ہدایات دی گئی ہیں:

۱) آیات ۲ تا ۶: یتیموں کے حقوق کی نگہداشت اور اُن سے حسنِ سلوک کی تاکید۔

۲) آیات ۷ تا ۱۴: تقسیم وراثت کے ضمن میں اخلاقی تعلیم بھی اور قانونی ضابطہ بھی جس کا تکملہ وتتمہ آیت ۱۷۶ میں وارد ہوا۔

۳) آیات ۱۵ تا ۱۶: جنسی بے راہروی کی روک تھام کے لیے تعزیرات کا بیان۔

۴) آیات ۱۹ تا ۲۵: عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید اور اس ضمن میں حسب ذیل اہم امور کی وضاحت کہ:

(ا) عورت آزاد شخصیت کی حامل اور قانونی تشخص کی حق دار ہے' نہ کہ مَردوں کی ملکیت یا مالِ وراثت۔

(ب) عورتوں کو دیا ہوا مہر یا دوسرا مال واپس لینے کے لیے ان کو بے جا تنگ کرنا اور اُن پر تہمت لگانا انتہائی دناءَت اور کمینہ پن ہے۔

(ج) باپ کی منکوحہ بیٹے پر حرام ہے۔

(د) اُن عورتوں کی تفصیل جن سے نکاح جائز نہیں۔

(ہ) نکاح کے اصل مقاصد گھر کی آبادی اور عصمت وعفت کی حفاظت ہیں نہ کہ صرف شہوت رانی یا مستی نکالنا' چنانچہ اس کی کچھ شرائط ہیں جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

(و) جو لوگ آزاد اور خاندانی مسلمان عورتوں سے نکاح کی استطاعت نہ رکھتے ہوں انہیں بدرجۂ مجبوری لونڈیوں سے نکاح کی اجازت۔

(ز) تعدّدِ ازدواج کی صورت میں عدل کی شرط۔[1]

---

(۱) یہ مضمون سورۃ کے بالکل آغاز میں آیت ۳ میں وارد ہوا ہے۔

(ح) اور پھر آیات ۱۲۷ تا ۱۳۴ میں مزید وضاحت کہ عدل میں صرف ان چیزوں کا لحاظ ہوگا جن میں ناپ تول ممکن ہو۔ دلی میلان و رغبت انسان کے اختیار سے باہر ہے' لہٰذا اس پر مؤاخذہ نہ ہوگا۔ البتہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ایک بیوی کی طرف اس طرح جھک جایا جائے کہ دوسری بے چاری نہ خاوند والی شمار ہو نہ بے خاوند! ----

(ط) یہ کہ اگر میاں بیوی میں کسی طرح بھی موافقت پیدا نہ ہو سکے تو بدرجہ مجبوری طلاق کا راستہ اختیار کر لینے میں کوئی قباحت نہیں۔ طلاق اللہ کو ناپسند تو ہے لیکن حرام نہیں! ہوسکتا ہے کہ اللہ دونوں کے لیے بہتر صورت پیدا فرما دے۔

(ی) گھریلو زندگی اور خاندانی نظام کے بارے میں ان تفصیلی احکام کے ساتھ اس سورۂ مبارکہ میں عائلی نظام کے ضمن میں اہم اصولی مباحث بھی وارد ہوئے۔ چنانچہ آیات ۳۲ تا ۳۵ میں تین اہم حقائق بیان ہوئے۔ ایک یہ کہ اللہ کی تخلیق میں بعض کو بعض پر مختلف پہلوؤں سے فضیلت عطا ہوئی ہے۔ بندوں کا کام یہ ہے کہ اسے خوش دلی سے قبول کریں۔ دوسرے یہ کہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں کو بعض اعتبارات سے فضیلت حاصل ہے اور خاندانی نظام کی صحت و درستی مرد کی قوامیت ہی کے اصول پر استوار ہوسکتی ہے۔ تیسرے یہ کہ نکاح کا بندھن اتنا معمولی نہیں ہے کہ ذرا سی بات پر توڑ دیا جائے' عدم موافقت اور باہمی نزاع و اختلاف کی صورت میں جانبین کے اعزہ و اقربا کو اصلاحِ حال کی سرتوڑ کوشش کرنی چاہیے۔

حکمت و معرفت

نظامِ عائلی کے بارے میں ان حکیمانہ مباحث کے علاوہ سورۃ البقرۃ کی طرح اس سورۂ مبارکہ میں دین کے بنیادی فلسفے اور حکمت کے بعض گراں قدر موتی بھی جا بجا جڑ دیے گئے ہیں' چنانچہ:

(۱) آیات ۲۶ تا ۲۸ میں نفسِ شریعت کے بارے میں اِفراط وتفریط کی نشان دہی کی گئی' یعنی یہ کہ بعض لوگوں کو تو شریعت فی نفسہٖ ایک ناگوار بوجھ نظر آتی ہے' حالانکہ وہ انسان کو فوز و فلاح سے ہمکنار کرنے اور اس کی زندگی کے گوناگوں مسائل و معاملات کو ایک حد درجہ حسین اِعتدال وتوازن کے ساتھ منضبط کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور دوسری طرف بعض لوگ شریعت میں اپنی مشکل پسند طبیعت کے باعث سختی پیدا کرتے چلے جاتے ہیں' جس سے لوگوں کی گردنوں پر واقعتہً بہت بھاری بوجھ آ جاتا ہے۔ اِن دونوں رجحانات سے بچنے کی شدید ضرورت ہے۔

(۲) آیات ۲۹ تا ۳۱ میں واضح کیا گیا کہ نظامِ شریعت میں احترامِ جان و مال کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اور معاصی کے ذیل میں واضح کیا گیا کہ اگر انسان اپنے آپ کو کبیرہ گناہوں سے بچالے تو اللہ تعالیٰ صغیرہ گناہوں کو بخش دے گا۔

(۳) آیات ۱۷'۱۸ میں توبہ کے بارے میں واضح کیا گیا کہ ایک توبہ تو وہ ہے جس کا قبول کرنا اللہ نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے' یعنی اُس شخص کی توبہ جس سے گناہ جذبات کی رو میں سرزد ہو گیا ہو اور وہ فوراً ہی رجوع کر لے --- اور دوسری توبہ وہ ہے جس کی قبولیت کا کوئی امکان نہیں۔ یہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو جان بوجھ کر معصیت میں زندگی بسر کر دیتے ہیں اور جب موت سرہانے آ کھڑی ہوتی ہے تب توبہ کرتے ہیں۔ ان دو اِنتہاؤں کے مابین معاملے کا ذکر حذف کر دیا گیا تا کہ انسان خوف اور رجاء کے بین بین رہے۔

(۴) آیات ۳۶ تا ۴۰ میں نہایت جامعیت کے ساتھ دین کے اساسی احکام کا خلاصہ پیش فرما دیا گیا' کہ دین کا اصل الاصول توحید ہے۔ چنانچہ وہ سب سے بڑا گناہ جس کی بخشش نہیں ہو گی' شرک ہے۔ اس کے بعد معاملہ ہے ادائے حقوق اور حسن سلوک کا' جس میں سرفہرست ہیں والدین' پھر رشتہ دار' پھر یتامیٰ و مساکین' پھر پڑوسی خواہ وہ رشتہ دار ہو خواہ اجنبی اور خواہ اُس کے ساتھ نہایت مختصر عرصے کے لیے عارضی ساتھ ہو گیا ہو' اور پھر ہیں مسافر! اور پھر ادائے حقوق سے گفتگو کا رُخ مڑ گیا انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید اور بخل کی

مذمت کی طرف۔

(۵) آیات ۴۱،۴۱، ۴۲ میں نقشہ کھینچ دیا گیا عدالت اُخروی کا، جس میں قوموں اور اُمتوں کے محاسبے کے وقت سرکاری گواہوں کی حیثیت سے پیش ہوں گے اُن کے انبیاء و رُسل۔ ان آیات کی قراءت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے سن کر آنحضورﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ ان کا ترجمہ یہ ہے:

''تو کیا ہوگا اُس دن جب کہ ہم ہر اُمت میں سے (اُس کے خلاف) ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپ کو کھڑا کریں گے (اے نبی!) ان لوگوں کے خلاف گواہ کی حیثیت سے۔ اس روز وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہوگا اور یا رسول کی نافرمانی کی ہو گی، خواہش کریں گے کہ کاش (وہ زمین میں دھنس جائیں اور) زمین ان پر برابر کر دی جائے۔ اور وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے!''

یہ گویا اسی ''شہادت علی الناس'' کا اُخروی پہلو ہے جس کا ذکر سورۃ البقرۃ میں آیا۔ اور جس طرح سورۃ البقرۃ میں اس کے معاً بعد مسلمانوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ اس عظیم منصب کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ضمن میں مدد حاصل کرو صبر اور صلوٰۃ سے، اسی طرح یہاں بھی اس کے فوراً بعد آیت ۴۳ میں ذکر آیا نماز کا، اور نماز کے ظاہری و معنوی موانع اور اُن سے نجات حاصل کرنے کے ذرائع کا۔

اُصولِ شہریت

عائلی اور گھریلو زندگی سے بلند تر سطح پر ایک صالح اور صحت مند معاشرے کی تعمیر کے ضمن میں سورۃ النساء میں بعض نہایت اہم اور اصولی ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ چنانچہ

(۱) آیت ۵۸ میں فرمایا گیا:

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اُن کے حق داروں کے سپرد کرو اور جب تم لوگوں کے مابین فیصلہ کرنے لگو تو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ یقیناً یہ بہت ہی اعلیٰ (اور عمدہ) نصیحت ہے جو اللہ تمہیں کر رہا ہے۔ اللہ تو ہے ہی سب کچھ سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا۔''

اور ظاہر ہے کہ ادائے امانت اور قیامِ عدل و انصاف کے بغیر کسی بھی صحت مند اِجتماعی نظام کی تعمیر کی توقع نہیں کی جا سکتی!

(۲) پھر آیت ۸۵ میں فرمایا:

''جو کوئی سفارش (یا تائید) کرے گا بھلائی کی تو اس کے اجر میں سے اسے بھی حصہ ملے گا اور جو کوئی سفارش یا تائید کرے گا برائی کی تو خود بھی اس کے وبال میں شریک ہو کر رہے گا' اور اللہ ہر ہر چیز کا پورا پورا حساب رکھنے والا ہے!''

ظاہر ہے کہ یہ بھی حیاتِ اجتماعی کا زرین اصول ہے اور یہ وہی بات ہے جو اگلی سورت یعنی سورۃ المائدۃ کی آیت ۲ میں اِن الفاظ میں آئے گی:

﴿ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ ﴾

''اور تعاون کرو بر و تقویٰ کے ہر کام میں اور ہرگز تعاون نہ کرو کسی بھی گناہ یا ظلم کے کام میں!''

(۳) پھر آیت ۸۶ میں ارشاد فرمایا:

''اور جب تمہیں سلام کیا جائے (یا دُعا دی جائے) تو تم بھی (جواباً) اس سے بہتر طور پر سلام کرو (یا دعا دو) ورنہ (کم از کم) اسی انداز میں لوٹا دو۔ یقیناً اللہ ہر ہر چیز کا حساب لینے والا ہے!''

یہ گویا آداب کی تعلیم ہے اور اس سے اسلامی معاشرے میں محبت و یگانگت کے اِحساسات پروان چڑھتے ہیں۔

اس سلسلے کی اہم ترین کڑی آیت ۱۳۵ ہے جس میں فرمایا گیا:

''اے اہل ایمان! پوری قوت و استقامت کے ساتھ عدل و انصاف کے علمبردار (اور) اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ!''

یہی ہدایت الفاظ کی ترتیب کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۃ المائدۃ کی آیت ۸ میں آئی ہے۔ اور یہ گویا اسی فرضِ منصبی کی ادائیگی کی تاکید ہے جس کے لیے اُمت مسلمہ برپا کی گئی' یعنی خلق پر خالقِ ارض و سماء کی جانب سے قولی و عملی شہادت اور اِتمامِ حجت! اور اس پر ختم ہوتا ہے اِس سورۂ مبارکہ کے ان حصص کے مضامین کا خلاصہ جن میں خطاب اُمت

مسلمہ سے بحیثیت اُمت مسلمہ ہوا ہے۔

خطاب بہ اہل کتاب

اہل کتاب کے ساتھ سورۃ النساء میں خطاب بہت مختصر ہے‘ یعنی پہلے آیات ۴۴ تا ۵۷ میں اور پھر آیات ۱۵۳ تا ۱۵۷ میں‘ اور ان میں بھی جہاں تک یہود کا تعلق ہے‘ ایک تو انداز براہِ راست گفتگو کا نہیں بلکہ بر سبیل تذکرہ اور بالواسطہ خطاب کا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ رنگ دعوت کا نہیں‘ بلکہ تمام تر ملامت اور زجر و توبیخ کا ہے۔ البتہ نصاریٰ کے ساتھ گفتگو براہِ راست بھی ہے اور اس میں تہدید و تنبیہہ کے ساتھ ساتھ دعوت اور افہام و تفہیم کا رنگ بھی موجود ہے۔

چنانچہ اس سورت میں ایک بار پھر یہود کے اُن جرائم کی فہرست سامنے آتی ہے جن کی تفصیل سورۃ البقرۃ میں بیان ہو چکی ہے۔ جیسے اللہ کی کتابوں میں لفظی و معنوی تحریف‘ یا صرف زبان کو توڑ موڑ کر یا لہجے کی تبدیلی سے الفاظ کے معانی کا بدل دینا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کا یہ کہنا کہ ہم نہیں مانیں گے جب تک کہ خدا کو خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ پھر نبی کی زندگی ہی میں بچھڑے کو معبود بنا لینا اور بدترین اور عریاں ترین شرک کا مرتکب ہو جانا‘ حضرت مریمؑ پر بہتان باندھنا‘ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی امکانی حد تک تو سولی پر لٹکا کر ہی دم لینا‘ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ نے انہیں اس سے بچا لیا اور آسمان پر اٹھا لیا۔ مزید برآں عملی و اخلاقی گراوٹوں کے ذیل میں سحر اور اعمالِ سفلیہ سے دلچسپی رکھنا‘ سود کھانا اور لوگوں کے مال حرام طریقوں سے ہڑپ کر جانا‘ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سب کے باوصف صاحبِ دین و شریعت ہونے پر فخر کرنا اور تقویٰ اور پرہیزگاری کا ڈھونگ رچانا۔ وَغَيْرَ ذٰلِكَ مِنَ السَّيِّئَاتِ!

اور ساتھ ہی نہایت زوردار الفاظ میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ ان کی چکنی چپڑی باتوں پر مت جاؤ۔ ان کے دلوں میں حسد کی آگ جل رہی ہے اور وہ تمہاری دشمنی میں بالکل اندھے ہو چکے ہیں اور تمہیں گمراہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے۔ ان

کے لیے یہ چیز نا قابل برداشت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین وشریعت اور کتابِ الٰہی کے حامل ہونے کا مقام اور مرتبہ ان سے چھین کر تمہیں عطا کر دیا۔ چنانچہ اب وہ تمہیں ہر ممکن طریق سے گمراہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

اس سورۂ مبارکہ میں یہ تنبیہات اس اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہیں کہ ان کا ایک بڑا حصہ' جو اِس کے نصف کے لگ بھگ ہے' نفاق اور منافقین سے بحث کرتا ہے' اور یہ مرض اصلاً یہود ہی کے چھوت سے مسلمانوں بالخصوص انصار کے دونوں قبیلوں یعنی اَوس اور خزرج کے ایسے لوگوں کو لگا جو یا تو خود بھی ضعف ایمان کی کیفیت میں مبتلا تھے اور دین کے بھاری تقاضے یعنی انفاقِ مال اور جہاد وقتال ان پر شاق گزر رہے تھے' گویا نفاق کی فصل کے لیے ان کے دلوں کی زمین پہلے سے تیار تھی جس میں یہود نے نہایت ہوشیاری اور مکاری سے اس مرض کے بیج بو دیے' یا وہ بہت سادہ لوح تھے اور اپنی سادگی کے باعث یہود کی چکنی چپڑی اور بظاہر عالمانہ وفاضلانہ باتوں سے متأثر ہو جاتے تھے۔ الغرض انصار اور یہود کے دیرینہ روابط اور قدیم مراسم ہی وہ خطرہ اور اندیشہ کی جگہ بن گئے تھے جہاں سے نفاق کا مرض اُمتِ مسلمہ میں جڑ پکڑ رہا تھا۔

یہود کی شر انگیزی کی ایک بہت نمایاں مثال جو اِس سورت میں بیان ہوئی' وہ یہ ہے کہ انہوں نے بظاہر نہایت معصومیت کے ساتھ آنحضورﷺ سے مطالبہ کیا کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بصورتِ الواح لکھی ہوئی کتاب عطا کی گئی تھی' ہم آپ کی نبوت کو تسلیم نہیں کریں گے جب تک آپ بھی ایسی ہی کتاب پیش نہ کریں' جس پر آیت ۱۶۳ سے آیت ۱۶۶ تک نبوت و رسالت اور ارسالِ وحی وانزالِ کتب کے ضمن میں نہایت اہم حقائق بیان ہوئے۔ اور یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ وحی پہلے بھی کسی ایک ہی صورت میں نہیں آئی' بلکہ مختلف صورتوں میں آتی رہی ہے۔ اور یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ بعثتِ رُسل کی اصل غرض صرف انذار وتبشیر ہے' تاکہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت قائم ہو جائے اور اُن کے پاس خدا کے یہاں پیش کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿رُسُلاً مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلاَّ يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ م بَعْدَ الرُّسُلِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۝۱۶۵﴾

''یہ سارے رسول خوش خبری دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر بھیجے گئے تھے' تا کہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔ اور اللہ بہر حال زبردست (اور) حکیم و دانا ہے۔''

نصاریٰ کے ساتھ گفتگو کی تقریب اس سورۂ مبارکہ میں یہود کے حضرت مریمؑ پر بہتان لگانے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں ان کے اس گمان سے پیدا ہوئی کہ معاذ اللہ ہم نے انہیں قتل کر دیا اور سولی پر چڑھوا دیا۔ چنانچہ ایک طرف تو یہود کے ان غلط دعاوی کی تردید کی گئی اور اصل حقیقت پر سے پردہ اٹھا دیا گیا اور دوسری طرف خود نصاریٰ سے خطاب کر کے فرمایا گیا:

''اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو سے کام نہ لو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کے رسول ہیں اور اس کا ایک خاص کلمہ' جو اس نے مریم کی جانب القاء کیا اور ایک رُوح اس کی جانب سے! پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور یہ نہ کہو کہ (خدا) تین ہیں (تثلیث کا دعویٰ نہ کرو)۔ باز آ جاؤ' یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اللہ تو بس اکیلا ہی معبود برحق ہے' وہ پاک ہے اس سے کہ اُس کے اولاد ہو۔ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اُسی کا ہے۔ اور اللہ کافی ہے بھروسے اور اعتماد کے لیے! نہ مسیح کو اللہ کی بندگی میں ہرگز کوئی عار ہے نہ ملائکہ مقربین کو۔ اور جو کوئی اللہ کی بندگی میں عار محسوس کرے گا اور تکبر کرے گا تو وہ اُن سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔ پھر جو لوگ ایمان والے بھی ہوں گے اور انہوں نے نیک عمل بھی کیے ہوں گے تو ان کو تو وہ بھرپور بدلہ بھی دے گا اور مزید اپنے فضل سے بھی نوازے گا' اور جنہوں نے عار و استکبار کی روش اختیار کی ہوگی تو انہیں وہ دردناک عذاب دے گا اور وہ اللہ کے مقابلے میں اپنے نہ کوئی دوست پائیں گے نہ مددگار۔ اے لوگو! آ چکی ہے تمہارے پاس تمہارے ربّ کی جانب سے دلیل و برہان بھی اور نازل کر دی ہے ہم نے تمہاری طرف واضح روشنی بھی۔ تو جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں گے اور اس کے دامن سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہو جائیں گے تو انہیں وہ داخل کرے گا اپنی رحمت اور فضل

(کے سائے) میں اور رہنمائی فرمائے گا ان کی اس صراطِ مستقیم کی طرف (جو سیدھی اس تک پہنچانے والی ہے)''۔(آیات ۱۷۱ تا ۱۷۶)

۞۞۞

تقریر نمبر ۵

خطاب بہ منافقین

سورۃ النساء کے وہ حصے جن میں روئے سخن منافقین کی جانب ہے' اس سورۂ مبارکہ کے لگ بھگ نصف پر مشتمل ہیں۔ ان کے بارے میں دو باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔ ایک یہ کہ چونکہ منافقین قانونی اعتبار سے اُمت مسلمہ ہی کا جزو تھے لہٰذا اُن سے خطاب: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ہی کے الفاظ سے ہوا ہے۔ لیکن خطاب کا مضمون اور اُس کا سیاق وسباق بتا دیتا ہے کہ یہاں روئے سخن مؤمنینِ صادقین کی جانب نہیں بلکہ منافقین کی طرف ہے۔ اگر یہ حقیقت ملحوظ نہ رہے تو بسا اوقات الفاظ کے عموم سے مغالطے کے باعث صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سوءِ ظن پیدا ہو سکتا ہے جو بڑی ہی قابل حذر بات ہے۔ دوسرے یہ کہ منافقین کو زجر وتوبیخ کے ضمن میں دین کے وہ تمام اُمور تفصیلاً زیر بحث آ گئے ہیں جو اُن پر گراں اور شاق گزرتے تھے اور اس طرح دین کے گراں اور ثقیل تقاضوں کے بیان کے ضمن میں سورۃ النساء کے اُن حصوں نے نہایت اہم اور جامع مقام کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

رسول ﷺ کی کلی اطاعت اور کامل متابعت

دین کے ان بھاری تقاضوں میں سے اوّلین اور اہم ترین ہے رسول اللہ ﷺ کی کلی اطاعت اور کامل متابعت' جو سرکش اور انانیت پسند طبائع پر ویسے بھی بہت شاق گزرتی ہے' اور خاص طور پر جب اس میں جان ومال کے کسی نقصان کا بھی اندیشہ ہو تب تو یہ ان لوگوں پر بہت ہی گراں گزرتی ہے جن کے دلوں میں ایمان راسخ نہ ہو چکا ہو۔ چنانچہ سب سے

پہلے آیت ۵۱ سے آیت ۷۰ تک اِس موضوع پر کلام ہوا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر یہ مقام قرآن مجید کا ''ذروۃ السنام'' ہے!!

(۱) اطاعت رسولؐ کے ضمن میں سب سے پہلے تو اسلام میں اطاعت کے نظام کا حوالہ دیا گیا کہ: ''اے اہل ایمان! اطاعت کرو اللہ کی' اور اطاعت کرو (اُس کے) رسول کی اور اپنے میں سے صاحب اختیار لوگوں کی۔ پھر اگر آپس میں جھگڑ پڑو کسی معاملے میں تو لوٹا دو اسے اللہ اور رسول کی جانب اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر آخرت کے دن پر!'' (آیت ۵۹) گویا اطاعت الٰہی کے مانند اطاعت رسول ﷺ بھی مستقل بالذات ہے۔ بقیہ تمام اطاعتیں اِن دونوں اطاعتوں کے تابع اور اُن کے ساتھ مشروط ہیں!!

(۲) دوسری بات یہ واضح کی گئی کہ رسول علیہم السلام بھیجے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ اُن کی اطاعت کی جائے۔ اُن کا کام معاذ اللہ چٹھی رسانوں کی طرح محض کتاب کا پہنچا دینا ہی نہیں ہے ' بلکہ وہ اپنی ذات میں مطاع ہوتے ہیں---- اور یہ اطاعت بھی اس درجہ کی مطلوب ہے کہ کسی معاملے میں اُن کا فیصلہ تسلیم نہ کرنا تو درکنار' اگر تسلیم تو کر لیا لیکن دلی رضامندی سے نہیں تو یہ بھی ایمان کے منافی ہوگا۔ فرمایا:

﴿ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾﴾

''پھر (اے نبیؐ!) جو کچھ آپ فیصلہ کریں اُس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں اور سر بسر تسلیم کر لیں۔''

(۳) اس تنبیہہ کے ساتھ ہی مثبت طور پر اطاعت اور اتباع رسول کا مقام و مرتبہ بھی واضح کر دیا گیا کہ:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾﴾

''اور جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت پر کاربند ہو گئے اُن کو معیت نصیب ہوگی ان کی جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ اور کیا ہی اچھے ہیں یہ رفیق (جو کسی کو میسر آئیں)''۔

(۴) آگے چل کر آیت ۸۰ میں مزید واضح کر دیا گیا کہ رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ ہی کی اطاعت ہے اور رسول کی نافرمانی دراصل اللہ کی نافرمانی ہے:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾

''جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے دراصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔''

قتال فی سبیل اللہ

دوسری چیز جو منافقین پر بہت گراں گزرتی تھی وہ تھا جہاد اور قتال کا حکم، جس میں جان و مال کو کھپانا پڑتا تھا اور شدید خطرات مول لینا پڑتے تھے۔ چنانچہ آیت ۷۱ سے قتال فی سبیل اللہ کا موضوع شروع ہوا۔ اور پہلے تو واضح الفاظ میں حکم دیا گیا کہ اے اہل ایمان! اپنی حفاظت کا سامان (یعنی تیر و تلوار اور ڈھال وغیرہ) ہاتھ میں لو اور نکلو اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے، باقاعدہ فوج کشی کے انداز میں بھی اور چھاپہ مار جنگ کے طریقے پر بھی! اور پھر ان لوگوں کو نہایت بلیغ پیرائے میں ملامت کی گئی جو اللہ کی راہ میں جنگ کرنے سے گریز کی راہیں تلاش کرتے رہتے تھے اور کبھی جان بوجھ کر تاخیر و تعویق کے بہانے بنا کر پیچھے رہ جاتے تھے اور کبھی دہائی دیتے تھے کہ: ''اے ہمارے ربّ! تو نے ہم پر یہ قتال کیوں فرض کر دیا؟ اور تو نے ہمیں مزید مہلت کیوں نہ دی؟'' (آیت ۷۷) اس ضمن میں ترغیب اور تشویق کے لیے ایک طرف حیاتِ دُنیوی کے مقابلے میں حیاتِ اُخروی کی سعادتوں اور اللہ کے اجر و ثواب کا حوالہ دیا اور دوسری طرف اُن کی غیرت وحمیت کو للکارا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں اور اِن کمزور اور ستائے ہوئے مسلمانوں کی نصرت و امداد کی غرض سے جہاد نہیں کرتے جو مشرکین کے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں؟ اور تیسری طرف اس حقیقت کی جانب بھی توجہ دلائی کہ اگر موت کا خوف آڑے آ رہا ہے تو موت سے تو کوئی مفر نہیں، وہ تو خواہ تم پہروں والے قلعوں میں چھپ کر بیٹھ جاؤ وہاں بھی تمہیں آ دبوچے گی۔

یہ مضمون آیت ۸۴ میں اپنے نقطۂ عروج (climax) کو پہنچ گیا ہے جس میں فرمایا گیا: ''اے نبی! (اگر یہ اللہ کی راہ میں قتال سے جی چرائیں تب بھی) آپ جنگ کریں اللہ کے

راستے میں۔ آپ پر اصلاً صرف اپنی ہی ذمہ داری ہے' البتہ اہل ایمان کو اس کے لیے اُبھارتے رہیں۔ کیا عجب اللہ اہل کفر کی جنگی قوت توڑ دے۔ اور بہت سخت ہے لڑائی میں اور بہت سخت ہے سزا دینے میں''۔ اس آیت سے مؤمنین صادقین کے قلوب پر کیا قیامت گزری ہوگی! اور جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا وہ کیسے تڑپ اُٹھا ہوگا' اور ضعفِ اِرادہ کا زنگ دلوں سے کیسے صاف ہو گیا ہو گا! اس کی ایک مثال اگلی سورت یعنی سورۃ المائدۃ میں بھی ہے' جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول نقل ہوا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے قتال سے انکار کیا تو انہوں نے بارگاہِ ربانی میں عرض کیا: ﴿رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِکُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَاَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۵﴾﴾ ''اے میرے ربّ! مجھے سوائے اپنی ذات اور اپنے بھائی کے اور کسی پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔ پس تو ہمارے اور ان نافرمان لوگوں کے مابین جدائی ڈال دے''۔ فرق صرف یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی تو عظیم اکثریت نے قتال سے انکار کیا تھا اور اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے صرف چند گنے چنے منافق تھے جنہوں نے جنگ سے جی چرایا۔

ہجرت

جہاد وقتال کے ساتھ ساتھ تیسری چیز جو منافقین پر بہت شاق تھی' وہ ہجرت کا حکم تھا' اس لیے کہ گھر بار چھوڑنا اور اعزہ واقرباء سے قطع تعلق کرنا آسان نہیں اِلّا آنکہ دلوں میں ایمان پختگی کے ساتھ جاگزیں ہو گیا ہو! اس سلسلے میں واضح رہنا چاہیے کہ ہجرت دراصل جہاد وقتال ہی کا پیش خیمہ تھی' اس لیے کہ اسی سے ایک مقام پر جمع ہو جانے کے باعث مسلمانوں کا وہ مرکز (base) وجود میں آیا جس سے کفر وشرک کے خلاف اِقدام کا امکان پیدا ہو سکا!

(ا) اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو آیات ۸۸'۸۹ میں واضح کر دیا گیا کہ جو لوگ ہجرت کے حکم عام کے بعد بھی ہجرت نہ کریں وہ گویا ثابت کر دیتے ہیں کہ انہیں وطن' یا گھر بار' یا اعزہ واقرباء' یا جائیداد یا کاروبار وغیرہ زیادہ محبوب ہیں اللہ اور اُس کے رسولﷺ اور اس کے

دین اوراس کے غلبے کی سعی وجہد سے۔اور یہی نفاق کی اصل حقیقت ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کوحکم دے دیا گیا کہ اُن سے کوئی واسطہ نہ رکھیں' اوراس سلسلہ میں کسی دلی تعلق یا مصلحت کو آڑے نہ آنے دیں۔

(۲) اس کے بعد آیات ۹۷ تا ۱۰۰ میں مزید وضاحت کردی کہ ''کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جب ملائکہ ان کی جانیں قبض کرتے ہیں اور ملامت کرتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟'' یعنی تمہارے ایمان نے کیسے گوارا کرلیا کہ ہجرت نہ کرو بلکہ دارالکفر ہی میں ڈیرہ لگائے رہو ؟ تو وہ عذر پیش کریں گے کہ: ''ہم زمین میں مغلوب ہو گئے تھے اور ہمیں دبا لیا گیا تھا۔'' جواب ملے گا: ﴿اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ﴾ ''کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں (کسی جانب) ہجرت کر جاتے؟'' پھر صاف اعلان کر دیا گیا کہ: ﴿فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾﴾ ''اُن کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔''

(۳) اس شدید وعید سے مستثنیٰ کیا گیا صرف ان معذور و مجبور لوگوں یا عورتوں اور بچوں کو جن کو نہ ذرائع سفر حاصل ہوں نہ راستے ہی کا علم ہو۔

(۴) اور آخر میں ترغیب اور تشویق کے لیے وضاحت فرما دی گئی کہ جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ اللہ کی زمین میں وُسعت بھی پائے گا اور پناہ کی جگہیں بھی۔ بقول شاعر:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے!

اور یہ کہ جو اثنائے سفر ہجرت میں واصل بحق ہوگیا اس سے قبل کہ دارالہجرت یعنی مدینہ منورہ پہنچ سکے وہ اللہ کے یہاں مہاجر ہی شمار ہوگا اور اُس کا اجر اللہ کے ذمے ہے' اس لیے کہ جیسا کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ))[۱]

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے!''

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب بدء الوحی' باب بدء الوحی۔

بعض ضمنی مباحث

قتال فی سبیل اللہ اور ہجرت کے مباحث کے ساتھ ساتھ ضمنی طور پر بعض ایسے مسائل بھی زیر بحث آ گئے جو اِس مرحلے پر عملی مشکلات کے طور پر سامنے آئے۔

(۱) ان میں سے ایک کسی مؤمن کے ہاتھوں مؤمن کا قتل ہے۔ اس ضمن میں فرمایا گیا کہ کسی مؤمن کے قتل عمد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' ہاں قتلِ خطا کا امکان موجود ہے۔ سو اس صورت میں ایک تو عام ضابطے کے مطابق مقتول کے ورثاء کو دیت دینی ہوگی اِلاّ آ نکہ وہ معاف کر دیں اور اضافی طور پر ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہوگا۔ البتہ اس صورت میں کہ مقتول کسی کافر قبیلے سے تعلق رکھتا ہو' دیت ادا نہیں کی جائے گی اور صرف مسلمان غلام کا آزاد کرنا کافی ہوگا۔ اور اگر وہ معاہد قبیلے سے تعلق رکھتا ہو تو دیت بھی دینی ہوگی۔ اور اگر کوئی شخص غلام آزاد کرنے کی اِستطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے پے بہ پے دو ماہ کے روزے رکھنے ہوں گے۔ آخر میں متنبہ کر دیا گیا کہ:

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا﴾ (آیت ۹۳)

''اور جس نے جان بوجھ کر کسی مؤمن کو قتل کیا تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا......''

(۲) دوسری ہدایت یہ دی گئی کہ حالتِ جنگ میں بھی اگر کوئی شخص اسلام و ایمان کا اظہار کرے تو اس کے اسلام و ایمان کو قبول کرنے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) تیسرا معاملہ صلوٰۃِ خوف کا ہے جس کی طرف اجمالی اشارہ سورۃ البقرۃ میں آ گیا تھا۔ اب اس کی تفصیلی صورت یہاں واضح کر دی گئی' خصوصاً آنحضور ﷺ کی موجودگی میں جب کہ بجا طور پر ہر شخص آپ ؐ ہی کی امامت میں نماز ادا کرنے کا خواہش مند ہوتا تھا کہ پہلے ایک گروہ آپ ؐ کی امامت میں نماز ادا کر لے اور بقیہ لوگ پہرے پر رہیں' پھر پہلا گروہ ان کی جگہ پہرے پر چلا جائے اور وہ لوگ آپ کے پیچھے نماز ادا کر لیں' تا کہ کوئی بھی آپ ﷺ کی اِقتداء کے شرف سے محروم نہ رہے! مزید تاکید فرما دی گئی کہ جیسے ہی حالات درست

ہوں نماز کے نظام کو اُس کے تمام ضوابط و آداب کے ساتھ قائم کرلو۔

منافقین کی شرارتیں

اس کے بعد آیات ۱۰۵ تا ۱۲۶، یعنی سولھویں، سترھویں اور اٹھارہویں رکوع میں منافقین کی شرارتوں کا ذکر ہے اور ان کے کردار کی پوری نشاندہی کر دی گئی ہے، تا کہ اہل ایمان ان کو اچھی طرح پہچان لیں اور کسی خاندانی یا گروہی عصبیت کے باعث ان کی حمایت پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ اس ضمن میں آیت ۱۰۹ میں بڑی سخت وعید وارد ہوئی کہ:

''ہاں، اس دنیا کی زندگی میں تم نے ان کی جانب سے جھگڑا کر لیا، لیکن (سوچو) قیامت کے دن ان کی جانب سے کون جھگڑا کرے گا، اللہ سے یا کون ان کا حمایتی (اور وکیل) بنے گا!''

ان کی شرارتوں کے ضمن میں اُن کے نجویٰ کا ذکر بھی کیا گیا جو وہ اپنی نجی محفلوں میں آنحضورﷺ اور مسلمانوں کے خلاف کیا کرتے تھے، اور اس کا بھی کہ غلطیاں خود کرتے تھے اور تھوپ دیتے تھے مخلص مگر سادہ لوح مسلمانوں پر۔ اور آخری بات جو ارشاد فرمائی گئی، وہ یہ کہ چونکہ وہ یہود کے زیر اثر تھے۔ لہٰذا اس سبب پر بھی ان ہی کی طرح کھوکھلی ''اَمَانِیّ'' کی بنا پر مغفرت ہی نہیں درجاتِ بلند کے امیدوار تھے۔ ع:

''ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بہ کجا!''

چنانچہ آیت ۱۱۵ میں واضح کر دیا گیا کہ: ''جو شخص رسول سے دشمنی رکھے گا اور مخلص اہل ایمان کا راستہ چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرے گا اسے ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا (اُس کو اُس کی شامتِ اعمال ہی کے حوالے کر دیں گے) اور (بالآخر) ہم اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور یہ بدترین جائے قرار ہے''۔

نفاق کی ماہیت

سورۃ النساء میں منافقین سے خطاب کا دوسرا حصہ آیات ۱۳۶ تا ۱۵۲ پر مشتمل ہے اور اس میں آغاز ایک انتہائی مؤثر اپیل سے کیا گیا ہے، یعنی:

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ط﴾

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اُس کتاب پر بھی جو اُس نے اپنے رسول پر نازل کی اور اُس کتاب پر بھی جو اس نے پہلے نازل کی۔''

گویا ایمان کے دو درجے ہیں۔ ایک ظاہری اور قانونی ایمان۔ یہ تو منافقین کو بھی حاصل تھا۔ دوسرا حقیقی اور قلبی ایمان جو عبارت ہے یقینِ محکم سے اور جس سے منافق بے بہرۂ محض تھے۔ چنانچہ آیت میں ان ہی سے خطاب فرما کر کہا گیا ہے کہ اصل قلبی ایمان تک رسائی کی کوشش کرو' اس لیے کہ اُخروی نجات کا دارومدار اسی پر ہے۔

پھر نفاق کی اصل حقیقت کو کھولا گیا کہ یہ ایمان اور کفر کے مابین تردّد اور تذبذب کی کیفیت کا نام ہے' کہ ایک قدم اِدھر ہے اور دوسرا اُدھر۔ چنانچہ آیت ۱۳۷' ۱۳۸ میں فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ سَبِیْلًا ﴿۱۳۷﴾ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَھُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۳۸﴾﴾

''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے' پھر کفر میں مبتلا ہوئے' پھر ایمان لائے' پھر کفر میں مبتلا ہو گئے' پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے' اللہ ان کو معاف فرمانے والا ہرگز نہیں ہے اور نہ راہ یاب کرنے والا ہے۔ ایسے منافقوں کو تو آپ (اے رسول!) دردناک عذاب ہی کی بشارت دے دیجیے!''

اور آیت ۱۴۳ میں فرمایا:

﴿مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ ق لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ ط﴾

''یہ اس (کفر و ایمان) کے درمیان مذبذب ہو کر رہ گئے ہیں' نہ (یکسوئی سے) اِدھر ہوتے ہیں اور نہ اُدھر۔''

منافقین کا کردار

پھر اِس مقام پر دوبارہ ان کے کردار کی بعض جھلکیاں دکھا دی گئیں' کہ ایک تو یہ

کافروں سے دوستی رکھتے ہیں اور اُن کے ساتھ روابط وتعلقات کو بنائے شرف وعزت جانتے ہیں اور دوسرے اتنے بے غیرت ہیں کہ اس واضح ہدایت کے باوجود بھی کہ اگر کہیں اللہ کی آیات کا مذاق اُڑایا جارہا ہو تو وہاں سے اُٹھ جاؤ' یہ وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اصل میں یہ منتظر ہیں کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اگر مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح ہو جائے تو یہ کہیں گے کہ ہم بھی تو تمہارے ساتھ ہی تھے اور اگر کہیں کافروں کو غلبہ حاصل ہو جائے تو یہ اُن کے سامنے اپنی خدمات گنوائیں گے کہ ہم نے مسلمانوں کو ایسے معاملات میں اُلجھائے رکھا کہ وہ یکسوئی کے ساتھ تمہارے مقابلے میں نہ آ سکے۔ گویا یہ اللہ اور اہل ایمان کے ساتھ دھوکے بازی کا معاملہ کر رہے ہیں' حالانکہ اللہ ان کی رسّی دراز کر کے انہیں فریب میں مبتلا کر رہا ہے۔ (واضح رہے کہ یہ وہی الفاظ ہیں جو سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع میں بھی وارد ہوئے تھے)۔ آخر میں ان کی عبادت گزاری کا پول بھی کھول دیا گیا کہ یہ نمازیں پڑھتے تو ہیں لیکن انتہائی کسل مندی کے ساتھ اور صرف دکھاوے کی!

نفاق کا انجام

اور اس کے بعد آئے وہ لرزہ خیز الفاظ جن سے اہل ایمان کے دل کانپ اُٹھتے ہیں' یعنی:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿١٤٥﴾﴾

''منافقین آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور تم اُن کے لیے کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔''

اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ! اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ النِّفَاقِ وَالرِّيَاءِ

''اے اللہ! ہم تیری پناہ میں آتے ہیں نفاق اور ریا کاری سے۔''

فَاَعِذْنَا مِنْهُمَا يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ

''پس اے ربّ العالمین! ہمیں ان دونوں چیزوں سے اپنی پناہ میں رکھو!''

تفریق بین اللہ و رُسلہ

اس طویل بحث کا اختتام اُسی مضمون پر ہوا ہے جس سے اس کا آغاز ہوا تھا' یعنی اللہ اور اُس کے رسولوں کے مابین تفریق' کہ اللہ کو مانا جائے اور رسولوں کا انکار کیا جائے' یا رسولوں میں سے بعض کو مانا جائے اور بعض کو نہ مانا جائے' یا اللہ کی اطاعت کا اقرار تو کیا جائے لیکن رسول کی اطاعت شاق گزرے۔ یہ تمام صورتیں دراصل کفر ہی کی ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے فرمایا گیا: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ﴾ ''وہ سب پکے کافر ہیں''۔ خواہ وہ بزعم خویش مسلم و مؤمن ہوں۔ غور کیا جائے تو جس طرح سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع میں جس کردار کی نقشہ کشی کی گئی تھی اُس میں یہود اور منافقین دونوں پوری طرح فٹ بیٹھتے تھے اسی طرح سورۃ النساء کے اس مقام پر بھی جس گمراہی کی نشاندہی کی گئی اس میں یہ دونوں گروہ شریک تھے اور دونوں کا مرض ایک ہی تھا' یعنی آنحضور ﷺ سے بغض و عداوت اور اُن پر ایمان یا اُن کی اطاعت سے اِباء و اعراض! اور یہ اس لیے کہ نفاق کا پودا درحقیقت یہود ہی کا کاشت کردہ تھا اور اُس کی آبیاری اُن ہی کے پروپیگنڈے اور ریشہ دوانی سے ہوتی تھی۔

آخر میں فرمایا کہ: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٥٢﴾﴾ ''اور (اس کے برعکس) جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور اُن کے مابین کسی قسم کی تفریق کے مرتکب نہ ہوئے اللہ عنقریب اُن کو اُن کے اجر عطا فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا (اور) رحم فرمانے والا ہے''۔ گویا بقول علامہ اقبال:

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ!

تقریر نمبر ۶

سورۃ المائدۃ

سورۃ الفاتحہ سمیت قرآن مجید کی پانچویں اور ابتدائی چار طویل مدنی سورتوں کے گروپ کی چوتھی اور آخری سورت سورۃ المائدۃ ظاہری اور معنوی دونوں اعتبارات سے زیادہ قریبی مشابہت تو رکھتی ہے سورۃ النساء سے، لیکن بحیثیت مجموعی اس پورے گروپ کے مشترک مضامین اس سورۂ مبارکہ میں تکمیل اور اِتمام کو پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ اس میں ایک طرف تو شریعت اسلامی کا وہ قصرِ عظیم پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے جس کا ابتدائی خاکہ سورۃ البقرۃ میں تیار ہوا تھا اور جس میں خصوصاً گھریلو زندگی سے متعلق احکام کے ضمن میں مزید تفصیلی رنگ سورۃ النساء میں بھرا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں شہنشاہِ ارض وسما کا وہ اہم فرمان بھی وارد ہو گیا کہ:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًاؕ﴾ (آیت ۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کی تکمیل فرما دی اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند (اور قبول) فرما لیا۔''

اور شریعت عطا کرنے کے بعد جس طرح سابقہ اُمتوں سے اُس کی پابندی کا پختہ عہد و پیمان لیا جاتا تھا۔ اسی طرح اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے بھی لیا گیا اور اس طرح اس سورت نے گویا ''سورۂ میثاق'' کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور اس کا انتہائی موزوں عنوان قرار پایا ایفائے عہد کا حکم۔ یعنی: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ (آیت ۱) ''اے اہل ایمان! پورے کیا کرو جملہ عہد و پیمان (اور قول و قرار)۔''

دوسری طرف اہل کتاب کو دعوت و ملامت اور اُن پر فی الجملہ اتمامِ حجت کے ضمن میں بھی جو طویل مباحث پچھلی تینوں سورتوں میں آئے تھے اُن پر آخری مہر اِس سورت میں

ثبت فرما دی گئی اور یہ مضمون بھی اس سورت میں تکمیل کو پہنچ گیا۔

ان دو بنیادی موضوعات کے علاوہ جو مدنی سورتوں کے اس گروپ کے لیے بمنزلۂ عمود ہیں' دوسرے اہم مضامین بھی جو پچھلی سورتوں میں آئے'اس سورت میں تکمیلی رنگ میں موجود ہیں۔مثلاً شہادتِ حق اور اُس کے دُنیوی و اُخروی پہلو' جہاد فی سبیل اللہ اور اس سے جی چرانے والے منافقین کو تنبیہہ و ملامت اور عقائد و ایمانیات کے اساسی مباحث اور حکمت و معرفت کے قیمتی موتی۔اس ابتدائی تعارف کے بعد آیئے کہ اس سورت کے مضامین کا تفصیلی جائزہ لیں۔اس ضمن میں یہ وضاحت پہلے کی جا چکی ہے کہ سورۃ النساء کی طرح اس سورت میں بھی مضامین ایک مضبوط بٹی ہوئی رسّی کے مانند گتھے ہوئے ہیں' بالکل علیحدہ علیحدہ حصوں میں منقسم نہیں ہیں۔

شریعت کے تکمیلی احکام

شریعت اسلامی کے ضمن میں جو تکمیلی احکام اس سورۂ مبارکہ میں نازل ہوئے وہ اجمالاً یہ ہیں:

(۱) کھانے پینے کی چیزوں کی حلت وحرمت کے ذیل میں آیات ۳ تا ۵ میں سورۃ البقرۃ میں بیان شدہ ضابطے کی مزید تشریح اور ایک طرف مردار'خون اور خنزیر کی فہرست میں مردار ہی کی مزید شرح کے طور پر گلا گھٹنے' چوٹ کھانے' اُونچائی سے گرنے یا کسی جانور کے سینگ مارنے سے مرے ہوئے جانوروں کا اضافہ۔اور دوسری جانب شرک کی نجاستِ باطنی کی بنا پر حرام ہونے میں غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے جانے والے جانوروں کے ساتھ اُن کا بھی شامل کیا جانا جو کسی استھان پر ذبح کیے گئے ہوں خواہ نام اللہ ہی کا لیا گیا ہو۔مزید برآں سدھائے ہوئے شکاری جانوروں کے ذریعے حاصل شدہ شکار'اہل کتاب کے ذبیحے'اور درندوں کے پھاڑے ہوئے جانوروں کے حلال ہونے کی صراحت' اگر وہ زندہ مل جائیں اور انہیں ذبح کر لیا جائے۔

(۲) نکاح کے ضمن میں آیت ۵ میں اہل کتاب کی شریف اور خاندانی خواتین سے نکاح

کی اجازت' نکاح کی ان جملہ شرائط کے اعادے کے ساتھ جو سورۃ النساء میں بوضاحت بیان ہوچکیں۔

(۳) حرمتِ جان و مال' جسے انسان کی اجتماعی زندگی کی شہ رگ کی حیثیت حاصل ہے اور جس کے بارے میں اُصولی بحث سورۃ النساء میں آ گئی تھی' کے ضمن میں آیات ۲۷ تا ۳۴ میں قتل ناحق کی مذمت کے ذیل میں پہلے ہابیل وقابیل کے واقعہ کا بیان' پھر تورات کے حکم کا بیان اور پھر اُن لوگوں کی سزا کی تشریح جو معاشرے میں فساد اور بدامنی پھیلانے کے جرم کے مرتکب ہوں' آیات ۳۸'۳۹ میں چوری کی سزا کا بیان یعنی قطع ید' اور آیت ۴۵ میں قصاص کے ضابطے کی مزید وضاحت!

(۴) آیت ۸۹ میں وضاحت کہ بلا مقصد کھائی ہوئی قسموں پر مؤاخذہ نہیں ہے لیکن سوچ سمجھ کر کھائی ہوئی قسم پر کفارہ دینا ہوگا' یعنی دس مساکین کو کھانا کھلانا یا کپڑے پہنانا یا ایک غلام کو آزاد کرنا۔ اور بصورتِ عدم استطاعت تین روزے۔

(۵) آیات ۹۰'۹۱ میں شراب' جوئے' استھانوں اور پانسوں کے تیروں کی قطعی وحتمی حرمت کا اعلان۔ مؤخر الذکر دونوں چیزوں کا ذکر آیت ۳ میں بھی ہے۔

(٦) نماز کے ضمن میں آیت ٦ میں وضو کے حکم کی تفصیل۔ اور مجبوری ومعذوری کی صورت میں وضو اور غسل دونوں کے قائم مقام کی حیثیت سے تیمّم کے اس ضابطے کا اعادہ جو سورۃ النساء میں بیان ہو چکا تھا۔

(۷) حج اور مقاماتِ حج اور متعلقاتِ حج کے ذیل میں پہلے آیات ا'۲ اور پھر آیات ۹۴ تا ۹۹ میں (ا) شعائر اللہ خصوصاً بیت اللہ' اشہرِ حرم' ہدی' قربانی کے جانوروں اور حجاجِ بیت اللہ کے احترام کا تاکیدی حکم۔ (واضح رہے کہ صفا اور مروہ کے شعائر اللہ میں شامل ہونے کی صراحت سورۃ البقرۃ میں آ چکی ہے)۔ (ب) احرام کی حالت میں شکار کی ممانعت۔ اور اس حکم کی خلاف ورزی پر سزا کے ضابطے کی تفصیل' اور اس کی تصریح کہ سمندر کا شکار اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔

(۸) وصیت کے سلسلے میں آیات ۱۰۶ تا ۱۰۸ میں قانون شہادت کی تفصیل، خصوصاً حالتِ سفر میں کیا کیا جائے اور یہ کہ اگر وصیت اور اس کی شہادت کے بارے میں اشتباہ پیش آ جائے تو کیا کیا جائے۔

حکمتِ تشریح

حکمت تشریح کے ذیل میں جو قیمتی ہدایات اس سورۂ مبارکہ میں وارد ہوئیں وہ یہ ہیں:

(۱) حکم دینے کا اختیار اللہ کو ہے اور اس کا یہ اختیار مطلق ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ①﴾ ''اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے''۔

(۲) شریعت کے احکام پر مسلمانوں کو معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کے بجائے خود اعتمادی کا اظہار کرنا چاہیے اور اغیار کے طعن و استہزاء کی ہرگز پروا نہیں کرنی چاہیے: ﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ﴾ (آیت ۳) ''پس اُن سے مت ڈرو اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔''

(۳) شریعت بوجھ نہیں تمام تر نعمت ہے: ﴿وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ⑥﴾ ''اور تاکہ اللہ اپنی نعمت پوری کرے تم پر، تاکہ تم شکر کرو۔''

(۴) البتہ تشدد پسندی بھی فتنے کا موجب ہے۔ رخصتوں سے فائدہ اُٹھانے میں ہچکچانا اچھا نہیں: ﴿مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ﴾ (آیت:۶) ''اللہ تم پر کوئی تنگی پیدا نہیں کرنا چاہتا۔''

(۵) اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو خواہ مخواہ حرام ٹھہرا لینا بہت بڑی گمراہی ہے۔ (آیات ۸۷، ۸۸)

(۶) اسی طرح ایمان لانے سے قبل جو حرام چیزیں کھائی یا پی ہیں اُن کے بارے میں بھی پریشانی کی ضرورت نہیں۔ وہ تمام حساب ایمان اور توبہ کے ذریعے صاف ہو جاتا ہے۔ (آیت ۹۳)

(۷) اہل ایمان کو ناپاک چیزوں کی کثرت سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے، اصل چیز طہارت و پاکیزگی ہے نہ کہ کثرت و قلت۔ (آیت ۱۰۰)

(۸) خواہ مخواہ کے سوالوں سے اجتناب کرنا چاہیے‘ خصوصاً جس وقت قرآن مجید نازل ہو رہا تھا غیر ضروری کھود کرید مباحات کے دائرے کو تنگ کرنے کا سبب بن سکتی تھی اور یہی طریقہ تھا جس سے یہود نے اپنے اوپر شریعت کے بوجھ میں اضافہ کرایا۔ (آیت ۱۰۱‘ ۱۰۲)

(۹) آخری اور اہم ترین یہ کہ شریعت ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ اس کے ایک جزو کا انکار بھی کل کا انکار شمار ہوگا‘ بلکہ جو مسلمان شریعت کے کسی ضابطے کو جان بوجھ کر توڑتا ہے وہ گویا ایمان کے ساتھ کفر کا ارتکاب کرتا ہے‘ اس کے تمام اعمال حبط ہو جائیں گے:

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ؗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۵﴾

”اور جس کسی نے ایمان (کی روش پر چلنے) سے انکار کیا تو اُس کا سارا عمل (کارنامۂ زندگی) ضائع ہو جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔“

یہ گویا وہی مضمون ہے جو سورۂ بقرہ میں یہود سے خطاب کے ضمن میں ان الفاظ میں آیا تھا کہ:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۸۵﴾

”کیا تم (اللہ کی) کتابِ الٰہی کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور (اس کے) دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ تو جو تم میں سے ایسا کرتا ہے اس کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں اور آخرت میں یہ شدید ترین عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے۔ اور اللہ اُس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔“

حاملین شریعت کی ذمہ داری اور مسئولیت

شریعت کے ضمن میں آخری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ یہ ایک معاہدہ ہے اللہ اور حامل

شریعت اُمت کے مابین۔ اس کی خلاف ورزی معاہدے کی خلاف ورزی ہے اور اس میں سہل انگاری سے عاقبت کی تباہی کا خطرہ ہے۔ یہ مضمون اس سورت میں تین اسلوبوں سے آیا ہے اور تینوں کے ضمن میں سابقہ اُمتوں کا حوالہ اور اُن کی محرومی کا بیان بھی آ گیا ہے۔

(۱) لفظ ''میثاق'' کے حوالے سے: چنانچہ آیت ۷ میں مسلمانوں سے فرمایا: ''اور یاد رکھنا اپنے اوپر اللہ کی اُس نعمت کو اور اللہ کے اُس میثاق کو جس میں اُس نے تمہیں جکڑ لیا ہے جب تم نے کہا کہ ''ہم نے سنا اور مانا'' اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ دلوں کے حال سے باخبر ہے!'' اور پھر آیات ۱۲ تا ۱۴ میں فرمایا کہ اسی طرح ہم نے ''میثاق'' لیا تھا بنی اسرائیل سے بھی اور نصاریٰ سے بھی' لیکن انہوں نے اسے جان بوجھ کر توڑا بھی اور طاقِ نسیاں کی زینت بھی بنا دیا۔ گویا یہی سبب ہے اس کا کہ شریعت کی نعمت ان سے چھین کر تمہیں دی جارہی ہے۔

(۲) حُکم بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ کی اصطلاح کے حوالے سے اس ضمن میں آیت ۱ میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ①﴾ ''یقیناً اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔'' آیت ۴۴ میں فرمایا: ''یقیناً ہم نے ہی تورات نازل کی تھی جس میں ہدایت بھی تھی اور روشنی بھی' جس کے ذریعے فیصلہ کرتے تھے (اللہ کے) نبی!'' اس کے بعد آئے آیات ۴۴' ۴۵' ۴۷ میں لرزہ طاری کر دینے والے الفاظ جن کا حاصل یہ ہے کہ: ''جو لوگ اللہ کی اُتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں' وہی ظالم ہیں اور وہی فاسق ہیں!'' اور یہی تھا وہ جرمِ عظیم جس کے مرتکب ہوئے یہود بھی اور نصاریٰ بھی۔ آخر میں آیات ۴۸' ۴۹ میں بتکرار و اعادہ آنحضور ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا: ''فیصلہ کیجیے اُن کے مابین اللہ کی اُتاری ہوئی شریعت کے مطابق!'' اور آیت ۵۰ میں جھنجھوڑنے کے انداز میں فرمایا: ''کیا یہ جاہلیت کے فیصلوں کے طلب گار ہیں؟ اور اہل ایمان و یقین کے لیے اللہ کے حکم سے بہتر اور کس کا فیصلہ ہو سکتا ہے!''

(۳) ''اقامت ما اُنْزِلَ مِنَ اللّٰهِ'' کی اصطلاح کے حوالے سے: چنانچہ پہلے آیت ۶۶

میں اہل کتاب کے بارے میں فرمایا: ''اور اگر وہ قائم کرتے تو راۃ اور انجیل کو اور جو کچھ نازل کیا گیا تھا اُن کی طرف اُن کے ربّ کی جانب سے تو لازماً کھاتے (یعنی ان کے لیے برکتیں نازل ہوتیں) اپنے اوپر سے بھی اور اپنے پاؤں تلے سے بھی! (یعنی زمین سے بھی رزق کے چشمے پھوٹتے)'' اور پھر آیت ۶۸ میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کر دیا گیا کہ: ''کہہ دو (اے نبی!) کہ اے اہل کتاب! تمہاری کوئی بنیاد ہی نہیں ہے جب تک کہ تم قائم نہ کرو تورات وانجیل کو اور اُس چیز کو جو تمہاری طرف تمہارے ربّ کی جانب سے نازل کی گئی!''

کاش کہ مسلمان اس آیت کو صرف ''یٰٓـاَھْلَ الْکِتَابِ '' کے بجائے ''یَا اَھْلَ الْقُرْآن '' کے الفاظ اپنے ذہن میں رکھ کر پڑھ سکیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ خدا کی رحمت ہم سے کیوں روٹھی ہوئی ہے اور ہماری دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں۔ چنانچہ اِسی خطاب ''یَـــا اَھْـلَ الْـقُـرْآنِ'' سے آغاز ہوتا ہے ایک حدیث کا جس میں آنحضورﷺ نے مسلمانوں کو حاملِ قرآن ہونے کی ذمہ داریوں سے آگاہ فرمایا ہے۔

شہادت علی الناس

لوگوں پر اللہ کی جانب سے حق کی شہادت اور اِتمام حجت کا جو فریضہ انبیاء و رُسل علیہم السلام ادا کرتے رہے اور جو اَب اُمتِ مسلمہ پر عائد کر دیا گیا ہے‘ اس کے ضمن میں اس سورۂ مبارکہ میں:

(۱) ایک تو وہی عظیم الفاظ ذرا ترتیب لفظی کے فرق کے ساتھ آیت ۸ میں آئے جو اِس سے قبل سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ میں آ چکے ہیں‘ یعنی: ''اے اہل ایمان! پوری قوت اور استقامت کے ساتھ اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ‘ عدل وانصاف کے گواہ بن کر!'' اس مزید اضافے کے ساتھ کہ: ''اور کسی قوم کی عداوت تمہیں اس پر ہرگز آمادہ نہ کر دے کہ تم جادۂ عدل سے منحرف ہو جاؤ۔ عدل کرو‘ یہ تقویٰ کے زیادہ قریب (یعنی تقویٰ سے مناسبت رکھنے والی چیز) ہے!'' اس مضمون کی تاکیدِ مزید اس سے قبل اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۲ میں آ چکی تھی اس اضافے کے ساتھ کہ مسلمانوں کو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کے لیے ہر

دم تیار رہنا چاہیے اور گناہ اور ظلم میں کبھی تعاون نہیں کرنا چاہیے۔

(۲) اور دوسرے یہ کہ اس سورۂ مبارکہ کے اختتام پر آیات ۱۰۹ تا ۱۲۰ میں ایک جھلک دکھا دی اس حقیقت کی جس کی خبر دی گئی تھی سورۃ النساء کی آیت ۴۱ میں کہ قیامت کی عدالت میں انبیاء ورُسلؑ اور داعیانِ حق سرکاری گواہوں کی حیثیت سے اپنی اُمتوں کے خلاف گواہ بنا کر کھڑے کیے جائیں گے۔ چنانچہ نقشہ کھینچ دیا گیا کہ کیسے حضرت مسیح علیہ السلام گواہی دیں گے کہ اے ربّ میں نے انہیں ہرگز حکم نہیں دیا تھا مگر انہی باتوں کا جن کا تو نے مجھے حکم فرمایا تھا۔ باقی اپنی تمام اعتقادی کجیوں اور عملی گمراہیوں کے ذمہ دار یہ خود ہیں۔

جہاد فی سبیل اللہ

اسی طرح جہاد وقتالِ فی سبیل اللہ کے حکم اور اُس کے لیے ترغیب وتحریص کے ذیل میں بھی:

(۱) پہلے تو آیات ۲۰ تا ۲۶ میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ شرمناک واقعہ بیان ہوا کہ جب اُن پر قتال فرض کیا گیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور اللہ کے رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بارگاہِ ربانی میں عرض کرنا پڑا کہ: ﴿رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِكُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَاَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۵﴾﴾ ''اے ربّ! مجھے سوائے اپنی جان اور اپنے بھائی کے کسی پر کوئی اختیار نہیں، پس تو ہمارے اور ہماری نافرمان قوم کے مابین تفریق فرما دے!'' یہ گویا شرح ہوئی اُسی بات کی جو سورۃ النساء میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرما کر کہی گئی تھی کہ اگر کوئی اور قتال کے لیے نہ نکلے تو آپ تن تنہا نکلیں! اور جس کا ایک عکس نظر آتا ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سیرت میں کہ جب مانعینِ زکوٰۃ سے قتال کرنے کے ضمن میں اختلافِ رائے ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ اگر اور کوئی جنگ کے لیے نہ نکلا تو میں تن تنہا نکلوں گا۔

(۲) اہل ایمان کو پہلے آیت ۳۵ میں مثبت طور پر جہاد کے لیے اُبھارا اور واضح کیا کہ اللہ تک رسائی اور اُس کی رضا کے حصول کا اصل ذریعہ ووسیلہ جہاد فی سبیل اللہ ہی ہے۔ اور پھر آیت ۵۴ میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ اگر تم نے اپنے دینی فرائض کو ادا کرنے سے پہلو

تہی کی تو اللہ تمہیں راندۂ درگاہِ حق فرما کر کسی اور قوم کو توفیق دے دے گا کہ ان فرائض کی انجام دہی کے لیے اُٹھ کھڑی ہو۔

حکمت ومعرفت

اساسی ایمانیات اور فلسفہ وحکمتِ دین کے قیمتی موتیوں کے ضمن میں اس سورۂ مبارکہ میں ایک تو آیت ۹۳ بڑی اہم ہے جس میں قانونی ایمان، جس میں اعمالِ صالحہ جزوِلاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں، اور پھر احسان کی منزلوں اور اس میں ترقی 'سیر الی اللہ' کی اصل قوتِ محرکہ یعنی تقویٰ کا بڑی جامعیت اور فصاحت وبلاغت کے ساتھ ذکر ہے۔

دوسرے دعوت وتبلیغ اور شہادت علی الناس کے ذیل میں دو عظیم حقائق بیان ہوئے یعنی ایک آیت ۶۷ میں کہ تبلیغ کُل کے کُل دین کی کرنا ہوگی۔ اس میں سے کسی ایک چیز کا کتمان بھی کل کا کتمان شمار ہوگا! اور دوسرے آیت ۱۰۵ میں کہ اگر انسان اپنی امکانی حد تک تبلیغ کا حق ادا کر دے تو پھر کسی کی گمراہی اس کے لے موجبِ ضرر ونقصان نہ ہوگی۔

معاندین سے خطاب

جہاں تک یہود ونصاریٰ اور منافقین کا تعلق ہے، اس سورۂ مبارکہ میں ایک بار پھر انہیں دعوتِ ایمان واصلاح بھی دی گئی ہے اور ان کی اعتقادی وعملی گمراہیوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے اور انہیں ملامت بھی فرمائی گئی ہے۔ لیکن اس موضوع کے اعتبار سے بھی اِس سورۂ مبارکہ کو ''حرفِ آخر'' کا درجہ حاصل ہے۔ اس سلسلے میں اہل کتاب نے جس طرح ''میثاق کتاب وشریعت'' کی خلاف ورزی کی اور ''حُکْم بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ'' اور ''اقامت مَا اُنْزِلَ مِنَ اللّٰہِ '' کے ضمن میں کوتاہیاں کیں، ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ آیت ۷۸ میں فرمایا گیا کہ اُن کے انہی کرتوتوں کے باعث یہود پر تو پہلے بھی حضراتِ داؤد وعیسیٰ علیہما السلام کی زبان سے لعنت کرائی جا چکی ہے جس کی تکمیل اب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کے ذریعے ہو رہی ہے، اور پھر آیت ۸۲ اور ۸۳ میں فرمایا کہ نصاریٰ میں ایسے حق پسند قِسِّیْسِیْن اور رُہبان

موجود ہیں جو جیسے ہی قرآن مجید کی آیات سنتے ہیں ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں اور وہ پکار اُٹھتے ہیں: ﴿رَبَّنَـــا اٰمَـنَّـا فَـاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴾ ''اے ربّ ہمارے! ہم ایمان لائے۔ پس ہمارا نام گواہوں کے ساتھ لکھ دے!'' اور اِس ضمن میں آخری تہدید وارد ہوئی آیت ۱۹ میں جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اے اہل کتاب! آ گیا ہے تمہارے پاس ہمارا رسول (ﷺ) تمہارے لیے (راہِ ہدایت کو) واضح کرتے ہوئے' رسولوں کے سلسلے میں ایک وقفے کے بعد' مبادا تم کہو کہ ہمارے پاس تو نہ کوئی بشارت دینے والا آیا نہ خبردار کرنے والا۔ پس آ گیا تمہارے پاس ارت دینے والا بھی اور خبردار کرنے والا بھی!''

یعنی آنحضورﷺ کی بعثت کے بعد اب تمہارے پاس کوئی عذر نہ رہے گا۔ یہ گویا تشریح ہے اس ضابطہ کی جو سورۃ النساء میں ان الفاظ میں وارد ہوا تھا:

﴿رُسُلاً مُّـبَشِّـرِيْـنَ وَ مُـنْذِرِيْنَ لِئَلاَّ يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۰ بَعْدَ الرُّسُلِ ط﴾ (آیت ۱۶۵)

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ OO

دوسرا گروپ

سورۃُ الانعام ...... تا ...... التّوبۃ

تقریر نمبر ۷

قرآن حکیم کا تقریباً دو تہائی حصہ مکی سورتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف کلام پاک کی طویل ترین مکی سورتوں کے ایک نہایت حسین اور جمیل جوڑے کی حیثیت رکھتی ہیں...... اِن دونوں میں خطاب کا اصل رُخ بنی اسمٰعیل بالخصوص قریش مکہ کی طرف ہے اور پورے مکی قرآن میں انہیں جن دلائل کے ساتھ توحید‘ معاد اور رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اُن کا ایک جامع خلاصہ ان دونوں سورتوں میں آ گیا ہے۔ ساتھ ہی چونکہ یہ مکی دَور کے آخری حصے میں نازل ہوئی ہیں لہٰذا ان میں تہدید وتنبیہہ کا رنگ بھی بہت نمایاں ہے۔ اور چونکہ اس زمانے میں آنحضورﷺ کی دعوت کا چرچا عرب میں دُور دُور تک پھیل چکا تھا اور آپﷺ کی مخالفت میں بالواسطہ طور پر یہود بھی شامل ہو چکے تھے‘ لہٰذا چند مقامات پر اُن کے اعتراضات کا جواب بھی ضمنی طور پر دیا گیا ہے‘ اگرچہ ان سے براہِ راست خطاب نہیں کیا گیا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے‘ تو چونکہ ابھی اُن کی حیثیت صرف ایک داعی جماعت کی تھی اور ان کے اپنے معاشرے یا ریاست کے قیام کا مرحلہ ابھی نہیں آیا تھا‘ لہٰذا انہیں شریعت کے تفصیلی احکام ابھی نہیں دیے گئے‘ بلکہ زیادہ تر حق و باطل کی کش مکش کے پس منظر میں جو اُس وقت انتہائی شدت اختیار کر گئی تھی‘ آنحضورﷺ اور آپﷺ کے جان نثاروں کو صبر وتحمل کی تلقین بھی کی گئی ہے اور حالات کی مناسبت سے ضروری ہدایات بھی دی گئی ہیں۔

سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف کے مابین مضامین کی تقسیم کو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی

اختیار کردہ دو اصطلاحات کے حوالے سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔یعنی سورۃ الانعام میں اسلوب زیادہ تر ''اَلتَّذْکِیْر بِاٰلآءِ اللّٰہ'' کا ہے'یعنی اللہ تعالیٰ کے احسانات اور اس کی ربوبیتِ عامہ کی نشانیوں کے حوالے سے ایمان کی دعوت ۔اور سورۃ الاعراف میں انداز ''اَلتَّذْکِیْر بِاَیَّامِ اللّٰہ'' کا ہے'یعنی گزشتہ قوموں پر اللہ کے رسولوں علیہم السلام کی تکذیب اور اُن کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار واعراض کی پاداش میں جو عذابِ استیصال نازل ہوئے ان کے حوالے سے انذار اور تہدید وتنبیہہ!

سُورۃ الانعام

تذکرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

سورۂ انعام ۱۶۵ آیات اور ۲۰۔رکوعوں پر مشتمل ہے اور اس کے عین وسط میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے کہ انہوں نے اوّلاً شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں آنکھ کھولنے کے باوجود کس طرح فطرتِ سلیمہ اور عقلِ سلیم کی رہنمائی میں نورِ توحید تک رسائی حاصل کی اور پھر انتہائی مخالفانہ ماحول میں وہ کس صبر وثبات اور استقلال و پامردی کے ساتھ توحید پر جمے رہے'اور نہ صرف یہ کہ پوری قوم کی مخالفت بھی ان کو مرعوب اور ہراساں نہ کر پائی بلکہ انہوں نے دلیل کے میدان میں اپنی پوری قوم کو شکستِ فاش دی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا کہ قریش مکہ نسلاً بھی اُن ہی کی ذریت تھے اور اس کے بھی مدعی تھے کہ وہ دینِ ابراہیمی ہی پر کاربند ہیں' جسے وہ دینِ حنفی بھی کہتے تھے۔ چنانچہ اُن پر واضح کیا گیا کہ اُن کے جدّ امجد نے تو تمام معبودانِ باطل کا انکار کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ:

﴿...... یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿۷۹﴾﴾

''اے میری قوم کے لوگو! میں اُن سب سے بیزاری ہوں (لاتعلقی کا اعلان کرتا

ہوں) جنہیں تم نے (خدائی میں) شریک سمجھ رکھا ہے۔ یقیناً میں نے تو بالکل یکسو ہوکر اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کرلیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو وجود بخشا اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

اور پھر جب قوم نے انہیں اپنے مزعومہ معبودوں اور دیوتاؤں کی سزا سے ڈرایا تو انہوں نے بے دھڑک اعلان کیا: ''آخر میں تمہارے (جھوٹ موٹ کے) شریکوں سے کیسے ڈروں' جبکہ تمہیں اللہ کے ساتھ اِن چیزوں کو شریک کرتے خوف نہیں آتا جن کے لیے اُس نے تمہارے اوپر کوئی سند نہیں اتاری۔ تو اگر تم جانتے ہو (عقل سے بالکل بے بہرہ نہیں ہو گئے ہو' تو خود غور کرو کہ) دونوں فریقوں میں سے امن (بے خوفی اور اطمینان) کا زیادہ حق دار کون ہے؟)(سن رکھو کہ) حقیقی امن بھی صرف اُن کے لیے ہے اور ہدایت پر بھی صرف وہی ہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک کی نجاست سے آلودہ نہ ہونے دیا!''

انبیائے بنی اسرائیل

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ ہی اس سورۂ مبارکہ میں سترہ انبیاء ورُسل علیہم السلام کا ذکر ہے۔ واضح رہے کہ حضراتِ انبیاءؑ کے اسماءِ گرامی کا اتنا عظیم اور حسین وجمیل گلدستہ قرآن مجید میں اس مقام کے علاوہ صرف ایک ہی مقام پر ہے اور وہ ہے سورۃ الانبیاء۔ ان جلیل القدر انبیاء ورُسلؑ کے ذکر کے بعد دو نہایت اہم باتیں ارشاد ہوئیں: ایک یہ کہ بفرضِ محال اگر یہ لوگ بھی شرک کرتے تو تمام تر جلالتِ شان کے باوجود اُن کے بھی تمام اعمال حبط ہو جاتے اور ساری نیکیاں اکارت جاتیں۔ گویا شرک اتنا بڑا جرم ہے کہ اُس کے ساتھ بڑی سے بڑی نیکی بھی مفید نہیں ہو سکتی۔ اور دوسرے یہ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ یہ ہے وہ مقدس جماعت جو اللہ کی جانب سے ہدایت پر تھی تو آپ بھی اُن کے نقش قدم پر چلیں، یعنی حق کی راہ میں جو مصائب انہوں نے جھیلے اور جس صبر وثبات کا مظاہرہ کیا وہی آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھ اہل ایمان کو کرنا چاہیے۔ اس میں ضمناً اہل کتاب کے سامنے یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمان ہرگز کسی نسلی تعصب

میں مبتلا نہیں ہیں، اس لیے کہ اگرچہ انبیاء بنی اسرائیل نسلاً یہود کے اسلاف میں سے تھے لیکن قرآن نے اُن کی جلالتِ شان کے بیان میں ہرگز کسی بخل سے کام نہیں لیا!

حسّی معجزے کا مطالبہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر کو اس سورۂ مبارکہ میں مرکزی اہمیت حاصل ہے اور ان کی سرگزشت میں دراصل ایک جھلک دکھا دی گئی ہے اس صورتِ حال کی جو اِس سورت کے نزول کے وقت سرزمینِ مکہ میں بالفعل موجود تھی کہ ایک جانب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے اور دوسری طرف سردارانِ قریش اور ان کے متبعین۔ اور نقشہ بعینہٖ وہی تھا کہ:

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

اور:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا اَمروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

سورۃ الانعام کے نزول کے وقت مکہ میں یہ کشمکش انتہائی شدت کو پہنچ گئی تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف سے لاجواب ہو کر سردارانِ قریش نے آخری مورچہ اس مطالبے پر لگا لیا تھا کہ ''اگر تم واقعتاً نبی یا رسول ہو تو کوئی محسوس معجزہ دکھاؤ!'' اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے اِس مطالبے کی ظاہری معقولیت سے عوام کی اکثریت بھی متأثر ہو گئی تھی، اور اس طرح اُس نے گویا ایک عوامی مطالبے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اُدھر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ گویا یہ تھا کہ نسل انسانی اس عہد طفولیت سے گزر آئی ہے جس میں اُسے حسّی معجزوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اب جسے بات سمجھنی ہے وہ عقل اور دلیل سے سمجھے اور جہاں تک دلیلوں اور نشانیوں کا تعلق ہے تو وہ آفاق واَنفس میں بھی چپے چپے پر موجود ہیں اور ان پر مُستزاد قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات ہیں جنھوں نے اُن کو معجزانہ انداز میں اُجاگر کر دیا ہے۔ جو فی الواقع

ہدایت کا طالب ہو اُس کی ہدایت کا تو پورا سامان ان میں موجود ہے' رہے وہ جن کی عقلوں پر پردے پڑ چکے ہوں اور دلوں پر مہر لگ چکی ہو' تو اُن کے حق میں بڑے سے بڑا حسّی معجزہ بھی مفید نہیں۔ اس صورتِ حال میں ظاہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمان کے صبر کا ایک سخت امتحان مضمر تھا۔ اور بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بعض اہل ایمان کے دلوں میں بر بنائے طبع بشری اِس خیال کا پیدا ہو جانا بالکل فطری تھا کہ اگر ان کا مطالبہ پورا کر دیا جائے اور ان کی پسند کا کوئی حسّی معجزہ دکھا ہی دیا جائے تو کیا حرج ہے؟ کیا عجب کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں' ورنہ کم از کم ان کی معقولیت اور حق پسندی کا پول تو کھل ہی جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ موضوع اس سورۂ مبارکہ میں جا بجا زیر بحث آیا ہے اور اس بحث کے اعتبار سے یہ سورت قرآن مجید کے ذروۃ السنام یعنی چوٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔

چنانچہ آیات ۴۸'۴۹ میں فرمایا:

''اور ہم (اپنے) رسولوں کو صرف بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجتے ہیں' پس جو ایمان لائیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو اُن پر نہ کوئی خوف ہے نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں ان کو عذاب آ پکڑے گا بسبب اپنی نافرمانیوں کے (وہ اپنی نافرمانیوں کی سزا بھگت کر رہیں گے!)''

آیت ۱۰۴ میں فرمایا:

''(دیکھو!) تمہارے پاس تمہارے ربّ کی جانب سے بصیرت عطا کرنے والی آیات آ چکی ہیں' تو جو بصیرت سے کام لے گا اُس کا فائدہ اُسی کو ہوگا۔ اور جو اندھا بنا رہے گا تو اُس کا وبال بھی اُسی پر آئے گا۔ اور میں ہرگز تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں!''

آیت ۵۰ میں فرمایا:

''کہہ دو (اے محمدؐ) میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ اللہ کے خزانے میرے اختیار میں ہیں اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے!''

آیت ۷ تا ۹ میں فرمایا:

''اور (اے نبیؐ!) اگر ہم آپ پر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی نازل کر دیتے اور

لوگ اُسے اپنے ہاتھوں سے چھوڑ کر بھی دیکھ لیتے تب بھی کافر یہی کہتے کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک صریح جادو۔ وہ کہتے ہیں اِن (حضرت محمدؐ) پر فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ اگر ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو لازماً (ان کا) فیصلہ ہی چکا دیا ہوتا' پھر کوئی مہلت انہیں نہ ملتی اور اگر ہم رسول بنا کر بھیجتے فرشتے کو تو اُسے بھی انسان ہی کی صورت میں بھیجتے اور انہیں اسی اشتباہ میں ڈال دیتے جس میں یہ اِس وقت مبتلا ہیں۔''

یہ مضمون پورے قرآن مجید میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا ہے اِس سورۂ مبارکہ کی آیات ۳۳ تا ۳۶ میں' جن کا ترجمہ بیان کرتے ہوئے دل لرزتا ہے۔ اس لیے کہ ان میں بظاہر آنحضور ﷺ پر عتاب فرمایا گیا ہے۔ لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ایسی آیات میں اگرچہ خطاب بظاہر آنحضور ﷺ سے ہوتا ہے لیکن عتاب کا رُخ دراصل کفار اور معاندین کی جانب ہوتا ہے جنھوں نے اپنی بے جا ہٹ دھرمی اور عیارانہ مطالبات سے گویا آنحضور ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی اہل ایمان کو اس درجہ زچ کر دیا کہ بعض مسلمانوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ کیوں نہ انہیں اُن کا مطلوبہ معجزہ دکھا ہی دیا جائے۔ اس تصریح کے بعد آیات کا ترجمہ سنئے' فرمایا:

''(اے نبی!) ہمیں خوب معلوم ہے کہ اُن کی باتوں سے آپ کو رنج پہنچتا ہے۔ لیکن یہ لوگ آپ کو تو نہیں جھٹلا رہے' یہ ظالم تو دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ آپ سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کی تکذیب کی گئی' لیکن انہوں نے (اس) تکذیب اور ایذا پر صبر کیا جو انہیں پہنچائی گئیں۔ یہاں تک کہ اُن کے لیے ہماری مدد آ پہنچی۔ اللہ کی باتوں کا بدلنا کسی کے بس میں نہیں۔ اور سابق رسولوں (کے حالات (کی خبریں آپ تک پہنچ ہی چکی ہیں۔ اور اگر (پھر بھی) آپ پر ان کا اعراض (اور انکار) گراں گزرتا ہے تو آپ کے لیے ممکن ہو تو زمین میں کوئی سرنگ کھود کر یا آسمان میں کوئی سیڑھی لگا کر اُن کے لیے کوئی نشانی لے آیئے اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو (زبردست) حق پر جمع کر دیتا۔ پس آپ ناسمجھوں میں سے نہ ہوں۔ دراصل (اس دعوتِ حق پر) لبیک وہی کہتے ہیں جو آپ کو سنائے ہی جا چکے ہیں۔ پھر بھی اگر آپ سے ان کا اعراض و انکار برداشت نہیں ہوتا تو اگر ممکن ہو تو

زمین میں سرنگ کھود کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر اُن کے لیے کوئی نشانی لے آیئے۔
اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو زبردستی حق پر جمع کر دیتا۔ پس آپ اس ناسمجھی سے بچیں۔
دراصل (اِس دعوتِ حق پر) لبیک وہی کہتے ہیں جو (فی الواقع) سننے والے ہوں۔
رہے وہ جو مردہ (حقیقت کے اعتبار سے مر چکے ہیں) تو انہیں اللہ ہی دوبارہ
اٹھائے گا' پھر وہ اسی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے!''

کفار اور معاندین کی اسی معنوی موت کی تعبیر آیت ۲۵ میں اِن الفاظ میں کی گئی:

''اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بظاہر تو آپ کی بات پوری طرح کان لگا
کر سنتے ہیں لیکن فی الواقع ہم نے اُن کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ وہ
اسے سمجھ نہ پائیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے۔ اور اگر تمام نشانیاں
بھی دیکھ لیں تو اُن پر ایمان نہیں لائیں گے!''

واضح رہے کہ اللہ کا کفار کے دلوں پر پردہ ڈالنا ابتداءً نہیں بلکہ ان کے اعراض و انکار کی سزا کے طور پر ہے۔ جیسا کہ اسی سورت کی آیت ۱۱۰ میں واضح کر دیا گیا کہ:

''اور ہم الٹ دیتے ہیں اُن کے دلوں اور اُن کی نگاہوں کو جیسے کہ وہ ایمان نہیں
لائے تھے (جبکہ حق ان پر منکشف ہو چکا تھا) پہلی بار' اور ہم چھوڑ دیتے ہیں انہیں
ان کی اپنی سرکشی ہی میں بھٹکتے رہنے کو!''

توحید اور معاد

مشرکین اور منکرین قیامت کو توحید اور معاد پر ایمان کی دعوت اس سورۂ مبارکہ میں آفاق و انفس کے جن دلائل اور فطرت کی جن بدیہیات کی بنیاد پر دی گئی ہے' ان کی تفصیل کا یہاں امکان نہیں ہے۔ ویسے بھی یہ مضامین اِن شاء اللہ دوسری سورتوں میں تفصیلاً زیر بحث آئیں گے!

یہود سے بالواسطہ خطاب

اہل کتاب' بالخصوص یہود کی جانب اس سورۂ مبارکہ میں چار مقامات پر اشارے کیے گئے ہیں۔ ایک آیت ۲۰ میں جہاں فرمایا گیا ہے کہ:

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی تھی وہ اسے)یعنی آنحضورﷺ یا قرآن مجید کو)
بالکل اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو(یہ دوسری بات ہے کہ) جو لوگ
اپنے آپ کو تباہ کرنے پر تل گئے ہیں پس وہ (ہرگز) ایمان نہیں لائیں گے!''

دوسرے آیات ۹۱‘ ۹۲ میں جہاں یہود کی اس ڈھٹائی کا ذکر کیا گیا کہ آنحضورﷺ کی دعوت کا راستہ روکنے کی دُھن میں وہ یہ تک کہہ گزرے کہ اللہ نے کبھی کسی انسان پر کچھ نازل نہیں کیا! چنانچہ بڑے بلیغ پیرائے میں اُن سے سوال کیا گیا کہ:

''(اے نبیؐ! ان سے)پوچھو کہ پھر اس کتاب کو کس نے نازل کیا تھا جسے موسیٰؑ لایا
تھا‘ جو انسانوں کے لیے روشنی بھی تھی اور ہدایت بھی جسے تم نے پارہ پارہ کر کے رکھ
دیا ہے کہ کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور اکثر کو چھپاتے ہو۔''

بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس سوال پر یہود میں سے جس میں بھی حق پسندی کی کوئی رمق باقی رہ گئی ہوگی اس کا سر ندامت سے کس طرح جھک گیا ہوگا! تیسرے آیت ۱۴۶ میں جہاں واضح کیا گیا کہ کھانے پینے کے ضمن میں جو سخت قدغنیں یہود پر لگائی گئی تھیں وہ شریعت اسلامی کا مستقل جزو نہ تھیں‘ بلکہ اُن کی سرکشی کی سزا کے طور پر عائد کی گئی تھیں۔اور آخری اور چوتھی بار آیت ۱۵۴ میں جہاں تورات کا ذکر نہایت شاندار الفاظ میں کیا گیا کہ:

''پھر ہم ہی نے موسیٰؑ کو وہ کتاب عطا کی تھی جو نیک کام کرنے والے (خیر کے
طالب اور بھلائی کے خواہاں) انسانوں پر نعمت کی تکمیل اور تمام ضروری اُمور کی
تفصیل اور ہدایت اور رحمت پر مشتمل تھی!''

وہاں اس کے ساتھ ہی وارد ہوا قرآن مجید کا ذکر آیت ۱۵۵ میں:

﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٥٥﴾﴾

''اور(اسی طرح) یہ کتاب ہے جو ہم نے نازل فرمائی ہے‘ سراپا خیر و برکت۔پس
اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو‘ تاکہ تم پر رحمت کا نزول ہو!''

شرائع سماویہ کی اساسی تعلیمات

سورۂ بنی اسراءیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع کے مانند اس سورۂ مبارکہ کے

انیسویں رکوع میں بھی ان اساسی تعلیمات کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے جو تمام آسمانی شریعتوں کا جزوِلاینفک رہی ہیں۔

(۱) اللہ کے ساتھ کسی کو کسی بھی اعتبار سے شریک نہ کرو!

(۲) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو!

(۳) اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو، ہم ہی تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے!

(۴) بے حیائی کے کاموں کے قریب بھی نہ پھٹکو، خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے!

(۵) کسی کو ناحق قتل نہ کرو!

(۶) یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر احسن طریق پر، یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے!

(۷) ناپ تول پورا کرو، حتی الامکان کامل عدل کے ساتھ!

(۸) جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ کسی رشتہ داری کا کیوں نہ ہو!

(۹) اللہ کے عہد کو پورا کرو!

(۱۰) آخری اور اہم ترین یہ کہ یہی ہے میرا سیدھا رستہ، تو اسی کی پیروی کرو اور دوسری پگڈنڈیوں پر مت چلو کہ وہ تمہیں اس کے راستے سے ہٹا کر پراگندہ کر دیں۔ اور یہ ہیں وہ باتیں جن کی ہدایت تمہارے ربّ نے تمہیں فرمائی، تاکہ تم اُس کے غضب سے بچ سکو۔

آنحضور ﷺ کا نعرۂ حق

سورۃ کے اختتام پر اِک نعرۂ حق آنحضور ﷺ کی زبان مبارک سے ادا کرایا گیا، جس میں ایک بار پھر اعادہ ہوا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر کا جسے، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، اس سورۂ مبارکہ کے عمود اور مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہے۔

''(اے نبی!) کہہ دو اعلان کر دو کہ میرے ربّ نے میری رہنمائی فرما دی ہے سیدھے راستے کی جانب (یعنی) اِس دین قیم کی طرف اور ابراہیمؑ کی ملت کی جانب جو بالکل یکسو تھے اور ہرگز مشرکین میں سے نہ تھے! کہہ دو میری نماز، میری

قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اللہ ربّ العالمین کے لیے ہیں۔جس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھے حکم ہوا ہے اور سب سے پہلے سرِ تسلیم خم کرنے والا میں خود ہوں!''

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ OO

❁❁❁

تقریر نمبر۸

سورۃ الاعراف

سورۃ الاعراف جو قرآن مجید میں آٹھویں پارے کے نصف سے لے کر نویں پارے کے تین چوتھائی حصے تک پھیلی ہوئی ہے اور ۲۰۶ آیات اور ۲۴ رکوعوں پر مشتمل ہے' قرآن حکیم کی طویل ترین مکی سورت ہے۔سورۃ الانعام کی طرح اس میں بھی خطاب کا اصل رُخ قریش مکہ کی جانب ہے۔اور اگرچہ بنی اسرائیل کی تاریخ کا وہ باب جو تورات کی کتاب الخروج سے مشابہت رکھتا ہے'اس سورۃ میں خاصی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ تاہم سورۃ الانعام کی طرح اس سورت میں بھی ان سے براہِ راست خطاب نہیں کیا گیا' بلکہ یہ تذکرہ تمہید بن گیا اس مفصل خطاب کے لیے جو یہود سے ہجرت کے بعد سورۃ البقرۃ میں وارد ہوا۔

قرآن حکیم میں سورۂ ابراہیم کی آیت ۵ میں آنحضورﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ:﴿ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ ط﴾ ''اور (اے نبیؐ!) آپ انہیں یاد دہانی کرائیے اللہ کے دنوں کے حوالے سے۔''اس آیت میں اللہ کے دنوں سے مراد وہ ایام ہیں جن میں اہم تاریخی واقعات رُونما ہوئے۔یعنی وہ ایام بھی جن میں رسولوں کی دعوت سے اعراض کی پاداش میں قوموں کی ہلاکت اور تباہی کے فیصلے صادر و نافذ ہوئے اور اس کے علاوہ وہ اہم واقعات بھی جو اس سلسلۂ تخلیق کی بساط بچھانے کے ضمن میں رُونما ہوئے یا اس بساط کے تہہ

کیے جانے کے وقت رُونما ہوں گے۔

سورۃ الاعراف اس ''تذکیر بایام اللہ'' کی حسین ترین مثال ہے۔ چنانچہ جس طرح سورۃ الانعام کے عین وسط میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی ذرّیت کے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کا ذکر تھا' اسی طرح اس سورۂ مبارکہ کے وسط میں آیت ۵۹ سے لے کر آیت ۱۳۷ تک ان چھ اولوا العزم رسولوں کا ذکر ہے جن کی قوموں پر اُن کو جھٹلانے اور اُن کی دعوت کو ردّ کر دینے کی پاداش میں عذاب نازل ہوا اور انہیں نیست و نابود کر دیا گیا' یعنی حضرت نوح' حضرت ہودؑ حضرت صالح' حضرت لوط' حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام۔ واضح رہے کہ ان چھ رسولوں کے حالات اور ان کی قوموں کے انجام کا ذکر قرآن مجید کی متعدد سورتوں میں وارد ہوا ہے' جیسے سورۂ یونس اور سورۂ ہود میں' اور سورۃ المؤمنون' سورۃ العنکبوت اور سورۃ الشعراء وغیرہ میں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ عرب اور اُس کے اطراف و جوانب کی تاریخ کے واقعات ہیں جن کا ذکر عرب کی روایات میں بکثرت موجود تھا۔ چنانچہ اہل عرب بالخصوص قریش مکہ کو بار بار اُن کی تاریخ سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی۔ ان میں سے قومِ نوحؑ عرب کے شمال مشرق میں آباد تھی۔ قوم ہودؑ یعنی عاد کا مسکن عرب کا جنوب مشرقی گوشہ تھا اور بقیہ چاروں اقوام یعنی ثمودؑ قومِ شعیبؑ' قومِ لوطؑ اور آلِ فرعون کے مسکن عرب کے شمال مغربی گوشے میں تھے۔ اور اُن میں سے تین تو وہ ہیں جن کی تباہ شدہ بستیاں اس تجارتی شاہراہ پر واقع تھیں جو حجاز سے شام تک جاتی تھی' یعنی جنوب سے شمال کی جانب پہلے مساکنِ ثمودؑ پھر مساکنِ قومِ شعیبؑ اور پھر قوم لوطؑ کی بستیاں جن کے کھنڈروں پر سے اہل عرب اپنے تجارتی سفروں کے دوران گزرا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی مکی سورتوں میں ان رسولوں اور اُن کی قوموں کا ذکر بتکرار و اعادہ آیا ہے' تاکہ قریش اُن کے حالات و واقعات سے سبق حاصل کریں اور اس غرّے میں نہ رہیں کہ ہمیں سرزمین عرب میں قوت و شوکت اور دبدبہ و اقتدار حاصل ہے۔ اس لیے کہ ان اقوام کو بھی اپنے اپنے زمانے میں اُن سے کہیں زیادہ غلبہ و اقتدار حاصل تھا' لیکن جب وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کی

گرفت میں آئے تو اُن کو ہلاکت و بربادی سے نہ اُن کی حشمت وسطوت بچا سکی نہ قوت و شوکت!

ان رسولوں کی دعوت کے ضمن میں الفاظ کے بار بار اعادے سے یہ حقیقت واضح کی گئی کہ ان سب کی بنیادی دعوت ایک ہی تھی' یعنی یہ کہ: ﴿یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! اللہ ہی کی بندگی (اور پرستش) کرو' تمہارا اس کے سوا کوئی معبود نہیں!'' ----گویا انسان کی ہدایت کا اصل الاصول توحید ہے اور تمام گمراہیوں اور ضلالتوں کی جڑ اور بنیاد شرک ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضراتِ نوح' ہود اور صالح علیہم السلام کے عہد تک ابھی انسانی تمدن بالکل ابتدائی مراحل میں تھا۔ چنانچہ ضلالت و گمراہی کی بھی صرف یہ جڑ ہی قائم ہوئی تھی۔ اس شجرۂ خبیثہ کے دوسرے ثمراتِ خبیثہ ابھی ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ لیکن پھر جیسے جیسے تمدن نے ارتقائی مراحل طے کیے اُس اُمّ الخبائث کے ثمرات و مضمرات کا ظہور بھی شروع ہو گیا۔ چنانچہ قومِ لوط کے حالات میں جنسی آوارگی اور بے راہروی (Sexual Perversion) کا ذکر ملتا ہے' قومِ شعیب کے حالات میں مالی بدعنوانیوں اور ناپ تول میں کمی بیشی اور چوری و راہزنی کا ذکر ملتا ہے اور آلِ فرعون کے حالات میں ایک قوم کے دوسری قوم پر ظلم اور جبر و تشدد کا ذکر ملتا ہے۔ غور کیا جائے تو آج بھی انسانی تمدن میں فساد کی یہی تین صورتیں ہیں' یعنی معاشرتی اقدار کی پامالی اور عفت و عصمت اور گھریلو امن وسکون کی بربادی' یا معاشی بدعنوانیاں یا سیاسی جبر و استحصال۔ اور درحقیقت یہ تینوں اصل نہیں فرع ہیں' یعنی جڑ نہیں شاخیں ہیں اس شجرۂ خبیثہ کی جس کی اصل اور جڑ کی حیثیت شرک کو حاصل ہے۔

اس میں گویا کہ تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ اے معشرِ قریش! تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ آج ہمارا رسول ﷺ تمہیں اسی توحید کی دعوت دے رہا ہے۔ تمہارے اخلاقی امراض کا علاج اور جملہ معاشرتی' معاشی اور سیاسی مسائل کا تمام تر حل اس دعوت کے قبول کرنے میں مضمر ہے۔ اس کی یہ دعوت تمام تر نصح و خیر خواہی پر مبنی ہے' بالکل اسی طرح جس طرح

ہمارے بندے نوح علیہ السلام نے کہا تھا کہ:

﴿اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴿٦٢﴾﴾

''میں تمہیں اپنے ربّ کے پیغامات پہنچاتا ہوں' اور تمہیں نصیحت کرتا ہوں (تمہارا خیرخواہ ہوں) اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں۔''

اور ہمارے بندے ہود علیہ السلام نے کہا تھا کہ:

﴿اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ﴿٦٨﴾﴾

''میں تم کو اپنے ربّ کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا خیرخواہ ہوں اطمینان (بھروسہ) کے لائق۔''

لیکن تم ہو کہ تکذیب واعراض کی اُسی ڈگر پر چلنے پر مصر ہو جس پر چلنے کے باعث ان اقوام کا انجام یہ ہوا کہ:

﴿كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ﴾ (آیت ۹۲)

''(وہ ایسے ہو گئے) جیسے کبھی اِن بستیوں میں آباد ہی نہ تھے۔''

اور:

﴿وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾ (آیت ۷۲)

''اور ہم نے کاٹ کر رکھ دی جڑ اُن لوگوں کی جنہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا تھا۔''

جس پر حد درجہ حسرت وتأسف کے ساتھ کہا تھا ہمارے بندے شعیب علیہ السلام نے کہ:

﴿يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ﴿٩٣﴾﴾

''اے میری قوم کے لوگو! میں نے پہنچا دیا تم تک پیغام اپنے رب کا اور حق ادا کر دیا تمہاری خیرخواہی کا۔ پھر اب کافروں کے انجام پر غم کروں تو کیسے!''

تو اے معشرِ قریش! اب تم بھی اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ! سورۃ الاعراف میں ایک عجیب صورت یہ سامنے آتی ہے کہ ۳۵ آیات میں حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت شعیب علیہ السلام تک پانچ رسولوں اور اُن کی قوموں کا ذکر ہوا۔ پھر ۹ آیات میں عذابِ

استیصال کے ضمن میں بعض اُصولی باتیں بیان ہوئیں اوراس کے بعد ۳۵ ہی آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر ہوا۔اس کا سبب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں بھی قریب ترین مماثلت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات سے پائی جاتی ہے اور اُمت مسلمہ کے حالات میں بھی قریب ترین مشابہت بنی اسرائیل کے حالات سے پائی جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے ذکر کے بعد بیان شروع ہوا بنی اسرائیل کے حالات کا' اور یہ سلسلہ بعد کی ۳۴ آیات تک چلا گیا۔اور یہ بیان جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' تمہید بن گیا یہود کے ساتھ اس مفصل خطاب کی جو ہجرت کے بعد سورۃ البقرۃ میں وارد ہوا۔

بنی اسرائیل کے حالات و واقعات کے اس تذکرے میں بڑے اہتمام کے ساتھ بیان ہوا ہے وہ واقعہ کہ جب بچھڑے کی پرستش کے واقعہ کے بعد اُن کے ستر سرکردہ لوگوں کو ساتھ لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر اجتماعی توبہ واستغفار کے لیے حاضر ہوئے اور وہاں انہیں اللہ کے حکم سے ایک زلزلے نے آ پکڑا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کی جناب میں عرض گزار ہوئے کہ:

''اے میرے ربّ! اگر تو چاہتا تو ہلاک کر دیتا پہلے ہی ان سب کو بھی اور مجھ کو بھی۔تو کیا تو ہمیں اُس (جرم کی پاداش) میں ہلاک کر دے گا جس کا ارتکاب ہمارے ناسمجھ لوگوں نے کیا؟ (واقعہ یہ ہے کہ) یہ بھی بس تیری طرف سے ایک آزمائش ہے۔تو اس کے ذریعے جس کو چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے ہدایت دے دے۔تو ہی ہمارا کارساز ہے' پس ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین بخشنے والا ہے۔اور (اے ہمارے ربّ!) لکھ دے ہمارے لیے بھلائی اس دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یقیناً ہم تیری جناب میں رجوع کرتے ہیں!'' (آیات ۱۵۶'۱۵۵)

اس پر جواب ملا:

''میں (اگرچہ) عذاب بھی دیتا ہوں جسے چاہتا ہوں' اور (لیکن) میری رحمت ہر چیز کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔(رہی میری رحمتِ خصوصی) تو اسے میں مخصوص

کر دوں گا اُن لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں گے اور زکوٰۃ ادا کرتے رہیں گے اور جو لوگ ہماری آیات پر ایمان لائیں گے' جو پیروی کریں گے اُس اُمی نبی (اور) رسولؐ کی جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا' انہیں برائی سے روکے گا اور اُن کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال ٹھہرائے گا اور اُن پر خبیث چیزوں کو حرام قرار دے گا اور اُن پر سے وہ بوجھ اور طوق اُتارے گا جو اُن پر پڑے ہوں گے۔ تو جو اُس پر ایمان لائیں' اس کی عزت کریں' اُس کی مدد کریں اور اس روشنی کی پیروی کریں جو اُس کے ساتھ اُتاری گئی تو وہی فلاح پانے والے ہوں گے!'' (آیات ۱۵۶' ۱۵۷)

اور اس کے بعد آنحضورﷺ سے کہلوایا گیا:

''کہہ دو اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں' اُس اللہ کا جس کی بادشاہت آسمانوں اور زمین کو محیط ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہی جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے امی نبی (اور) رسولؐ پر جو ایمان رکھتا ہے اللہ پر بھی اور اُس کے کلمات پر بھی' اور پیروی کرو اُس کی تاکہ تم راہ یاب ہو سکو!'' (آیت ۱۵۸)

یہ گویا تمہید ہے اُس دعوتِ ایمان کی جو یہود کو ہجرت کے بعد سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع میں براہِ راست خطاب کر کے دی گئی۔

سورۃ الاعراف کے ابتدائی سات رکوعوں میں سے پہلے کی حیثیت تو ایک جامع انڈکس کی ہے' جس میں گویا اس سورت کے جملہ مباحث کے عنوانات جمع کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس میں وہ الفاظ بھی آئے ہیں جو گویا جامع عنوان ہیں رسولوں کے حالات اور ان کی قوموں کے انجام کے ذکر کے لیے جو اِس سورت کے اکثر حصے پر پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

''اور کتنی ہی بستیاں ایسی ہوئی ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا تو آدھمکا اُن پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت یا (عین دن کے وقت) جبکہ وہ قیلولہ کر رہے تھے۔ جب اُن پر ہمارا عذاب آیا تو انہوں نے بس یہی کہا کہ بلا شبہ ہم ہی ظالم تھے۔ تو

(جان لو!) ہم لازماً ان لوگوں سے بھی پرسش کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے
گئے اور ہم خود رسولوں سے بھی لازماً سوال کریں گے!'' (آیات ۴ تا ۶)

اس کے علاوہ مکی سورتوں کے عام اسلوب کے مطابق توحید' معاد اور رسالت پر ایمان لانے کی وہ دعوت بھی اختصار کے ساتھ آ گئی ہے جو اِس سے قبل سورۃ الانعام میں تفصیلاً آئی تھی۔ اور ان پر مستزاد ہے اس سورت کے عام اسلوب کے مطابق ذکر اس سلسلۂ تخلیق کے آغاز اور انجام سے متعلق بعض حالات و واقعات کا۔ چنانچہ پہلے قدرے تفصیل کے ساتھ قصۂ آدم و ابلیس بیان ہوا ہے اور پھر احوالِ آخرت کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ کس حال میں ہوں گے اہل جنت اور اہل جہنم' اور کیا گفتگو ہو گی اُن کے مابین۔ اس ضمن میں اصحابِ اعراف کا ذکر بھی قدرے تفصیل سے آیا ہے!

اسی طرح اس سورت کے اختتام پر بھی اوّلاً تو دو واقعات کا بیان ہوا۔ ایک نوعِ انسانی کی تخلیق کے اوّلین مرحلے کا جب ارواحِ انسانی کو وجود بخشا گیا اور اُن سے وہ عہدِ الست لیا گیا جو محاسبۂ اُخروی کے وقت بطورِ دلیل و حجت پیش ہو گا اور دوسرے بنی اسرائیل کے ایک حد درجہ پارسا اور عالم و فاضل شخص کے شیطان کے ایک ہی چکمے میں آ کر گناہ کی انتہائی پستیوں میں جا گرنے کا۔ جس سے گویا ایک بار پھر وہی حقیقت سامنے لائی گئی جو ابتدا میں آدم و ابلیس کے واقعے میں بیان ہوئی تھی کہ شیطان آدم اور ذریتِ آدم کا ازلی و ابدی دشمن ہے۔ اس کی چالوں سے پوری طرح ہوشیار و چوکس رہنے کی ضرورت ہے اور اس کے مقابلے میں مؤمن کا اصل دفاع ذکرِ الٰہی اور اللہ کی پناہ طلب کرتے رہنے میں ہے نہ کہ کسی ادعاءِ علم و فضل یا غرورِ برّ و تقویٰ میں۔ چنانچہ تقریباً اختتام پر فرمایا گیا:

''اور اگر تمہیں کوئی وسوسۂ شیطانی لاحق ہونے لگے تو فوراً اللہ کی پناہ طلب کرو۔ بے شک وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ یقیناً تقویٰ اختیار کرنے والے (خدا سے ڈرنے والے) لوگوں پر اگر کبھی شیطان کا گزر ہوتا ہے (شیطان کی چھوت لگنے کا اندیشہ ہوتا ہے) تو وہ چونک جاتے ہیں (فوراً خدا کا دھیان کرتے ہیں) چنانچہ اُن کو (فوری) بصیرت حاصل ہو جاتی ہے!'' (آیات ۲۰۰' ۲۰۱)

سورت کے اوّل و آخر میں قرآنِ حکیم کا ذکر ہے۔ آغاز میں فرمایا گیا:

''یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف اتاری گئی۔ پس (اے نبیؐ!) نہ اس لیے کہ تمہارے دل میں اس سے پریشانی لاحق ہو' بلکہ اس لیے کہ تم اس کے ذریعے (لوگوں) کو خبردار کر دو اور اہل ایمان کے لیے یاددہانی۔ (لوگو!) جو چیز تمہارے پاس تمہارے ربّ کی جانب سے آئی ہے اس کی پیروی کرو اور اسے چھوڑ کر دوسرے اولیاء (سرپرستوں) کی پیروی نہ کرو۔ (واقعہ یہ ہے کہ) تم کم ہی یاددہانی حاصل کرنے والے ہو۔'' (آیات ۱تا۳)

اور اختتام پر فرمایا:

''کہہ دو (اے نبیؐ!) میں تو خود پیروی کرتا ہوں اس چیز کی جو میرے ربّ کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ یہ تمہارے ربّ کی طرف سے بصیرت عطا کرنے والی آیات ہیں' اور ہدایت اور رحمت ہیں اُن کے حق میں جو ایمان لائیں۔ اور (اے مسلمانو!) جب (تمہارے سامنے) قرآن پڑھا جارہا ہو (تمہیں قرآن سنایا جارہا ہو) تو اُسے (کان لگا کر) توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔ (آیات ۲۰۳' ۲۰۴)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

تقریر نمبر ۹

سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف دو مکی سورتوں کے بعد قرآن مجید میں سورۃ الانفال اور سورۃ التوبۃ پر مشتمل دو مدنی سورتوں کا موزوں اور متناسب جوڑا آتا ہے' جن میں موضوع اور مضامین کے اعتبار سے اتنا گہرا ربط اور انداز اور اسلوب کے اعتبار سے اتنی موزونیت موجود ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ دونوں ایک ہی سورت ہوں۔ چنانچہ بعض حضرات نے سورۃ التوبۃ کے آغاز میں بسم اللہ نہ لکھے جانے کی فی الواقع یہی توجیہہ بیان بھی کی ہے' لیکن بوجوہ یہ خیال درست نہیں ہے۔ صحیح یہی ہے کہ دونوں علیحدہ علیحدہ سورتیں

ہیں اور سورۃ التوبۃ کے آغاز میں بسم اللہ نہ لکھے جانے کا سبب اصلاً تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا حکم دیا۔ البتہ اس کی توجیہہ کے ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول وزنی معلوم ہوتا ہے کہ بسم اللہ آیت امان ہے، چونکہ اس میں اللہ کے اسمائے حسنیٰ رحمٰن اور رحیم آئے ہیں، جب کہ یہ سورت گویا ہاتھ میں تلوار لیے نازل ہوئی ہے، اس لیے کہ اس کا آغاز آیاتِ براءت یعنی اظہارِ بیزاری اور اعلانِ جنگ سے ہوتا ہے، لہٰذا موزوں یہی تھا کہ اِس کے آغاز میں آیت بسم اللہ نہ تحریر کی جائے!

ترتیب نزولی کے اعتبار سے سورۃ الانفال کا نمبر سورۃ البقرۃ کے بعد ہے، اس لیے کہ یہ سورت غزوۂ بدر کے فوراً بعد نازل ہوئی اور محسوس ہوتا ہے کہ بیک وقت ایک مربوط اور مسلسل خطبہ کی صورت میں نازل ہوئی۔ لیکن ترتیب مصحف میں اس کو سورۃ الانعام و سورۃ الاعراف کے بعد اور سورۃ التوبۃ سے قبل رکھا گیا اور اس میں نظمِ کلام کے اعتبار سے غایت درجہ حکمت مضمر ہے، اس لیے کہ سورۃ الانعام گویا بنی اسماعیل کو بالعموم اور قریش مکہ کو بالخصوص دعوت کی سورت ہے۔ اور سورۃ الاعراف کی حیثیت ان کے لیے آخری تنبیہہ اور تہدید یعنی warning کی ہے۔ اس کے بعد فطری طور پر مشرکین عرب بالخصوص قریش پر عذاب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ قریش مکہ کو عذاب سے امان اُس وقت تک حاصل رہی جب تک آنحضور ﷺ مکہ میں مقیم رہے۔ جب آپؐ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے تو گویا امان اُٹھ گئی اور عذاب کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں پہلی قسط کی حیثیت حاصل ہے غزوۂ بدر میں قریش مکہ کے ستر سورماؤں کے قتل کو جن میں اُن کے بعض چوٹی کے سردار بھی شامل تھے۔ حتیٰ کہ اُن میں عتبہ بن ربیعہ بھی تھا جس کو اشرافِ قریش میں ایک نمایاں مقام حاصل تھا اور ابو جہل بھی تھا جس کے بارے میں خود آنحضور ﷺ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے کہ: ((هٰـذَا فِرْعَوْنُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ)) کہ اسے اس دَور کے فرعون کی حیثیت حاصل ہے!

مشرکینِ عرب پر عذابِ خداوندی کے جس سلسلے کا آغاز غزوۂ بدر سے ہوا تھا وہ تکمیل و اتمام کو پہنچا ۹ ھ میں، جب کہ حج کے موقع پر آنحضور ﷺ نے اعلانِ عام کرا دیا کہ چند ماہ کی

مہلت دی جاتی ہے' اس کے بعد مشرکین کے خلاف اقدامِ عام شروع ہو جائے گا۔ اب جسے جزیرہ نمائے عرب میں رہنا ہو وہ اطاعت قبول کر لے اور اسلام لے آئے' بصورتِ دیگر اس سرزمین کو خیرباد کہہ کر جہاں سینگ سمائے چلا جائے۔ بہرصورت جزیرہ نمائے عرب کو چند ماہ کے بعد کفر اور شرک سے بالکل پاک کر دیا جائے گا۔

ان تصریحات کے پیشِ نظر دو مکی اور دو مدنی سورتوں کے اس گروپ نے انتہائی مربوط اور منظّم کلام کی صورت اختیار کر لی ہے! فَافْهَمُوْا وَتَدَبَّرُوْا!

سورۃُ الانفال

سورۃ الانفال جو ۷۵ آیات اور دس رکوعوں پر مشتمل ہے' اکثر و بیشتر غزوۂ بدر کے حالات و واقعات اور ان پر حکیمانہ تبصرے اور مسلمانوں کو دعوتِ اسلامی کے اس نئے دَور کے تقاضوں کی تیاری کی ہدایات پر مشتمل ہے جو غزوۂ بدر سے شروع ہو چکا تھا اور جسے جدید اِصطلاح میں عملی اقدام (Active Resistance) یا مسلح تصادم (Armed Conflict) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس سورۃ کا آغاز تو قرآن حکیم کے معروف اسلوب کے مطابق اُس مسئلے کے ذکر سے ہوا جو اس وقت بحث و نزاع اور چہ میگوئی کا اہم موضوع بن گیا تھا' یعنی مالِ غنیمت کا مسئلہ جس پر پہلے سے کسی قانون یا ضابطے کے موجود نہ ہونے کے باعث مسلمانوں میں اختلاف کا پیدا ہو جانا بالکل فطری تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اُسے معاندین نے مخالفانہ پروپیگنڈے کا ذریعہ بھی بنا لیا تھا' کہ یہ کیسے رسول ہیں جو اپنی ہی قوم کے خلاف تلوار اٹھاتے ہیں اور اپنے ہی بھائی بندوں کو قتل کرتے ہیں' اور اُن کا مال ہڑپ کرتے ہیں اور ان کے اسیروں سے رہائی کے عوض زرِ فدیہ وصول کرتے ہیں۔ چنانچہ پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اے نبیؐ! لوگ آپ سے اموالِ غنیمت کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں۔ ان کو بتا دیجیے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کا حق ہے' پس اللہ سے ڈرو اور

اپنے مابین تعلقات کو درست رکھو اور اللہ اور اُس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت پر کار بندر ہو اگر تم واقعی مؤمن ہو!''

اور اس کے بعد نہایت شاندار الفاظ میں اہل ایمان کے اوصاف کا ذکر ہوا اور بتا دیا گیا کہ حقیقی مؤمن کون ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ سورۃ الانفال کا آغاز بھی اسی موضوع سے ہوا اور اس کے اختتام پر پھر یہی موضوع زیر بحث آیا اور ان دونوں مقامات نے مل کر ایمانِ حقیقی کی حد درجہ جامع و مانع تعریف کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ آیات ۲ تا ۴ میں فرمایا:

''حقیقی مؤمن تو صرف وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے دل لرز اُٹھیں اور جب انہیں اس کی آیتیں سنائی جائیں تو اُن کے ایمان (اور یقین) میں اضافہ ہو اور اُن کا تمام تر بھروسہ اپنے ربّ ہی پر ہو۔ جو نماز قائم کریں اور ہمارے دیے ہوئے میں سے خرچ کریں۔ یہی ہیں سچے مؤمن۔ اُن کے لیے اُن کے ربّ کے پاس مراتب عالیہ بھی ہیں اور مغفرت اور رزقِ کریم بھی!''

اور آیت ۷۴ میں فرمایا:

''اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا' اور وہ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی تو یہی ہیں حقیقی مؤمن اُن کے لیے (اللہ کی) مغفرت (کا وعدہ) بھی ہے اور باعزت رزق (کا وعدہ) بھی!''

یہ گویا وہی بات قدرے شرح وبسط کے ساتھ ہے جو اجمالاً بیان ہوئی ہے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں کہ:

''مؤمن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائیں اللہ اور اُس کے رسول پر' پھر شک میں نہ پڑیں اور جہاد کریں اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ حقیقتاً یہی (لوگ دعوائے ایمان میں) سچے ہیں!''

اس ابتدا اور انتہا کے مابین جو مضامین سورۃ الانفال میں بیان ہوئے ہیں اُن کا اجمالی جائزہ یہ ہے:

(ا) غزوۂ بدر کے حالات و واقعات کے ضمن میں ایک جانب تو آیات ۵ تا ۸ میں بعض مسلمانوں کی اس کمزوری کی نشاندہی کی گئی کہ جب آنحضور ﷺ نے اہل ایمان کے حوصلے

اور morale کا اندازہ کرنے کے لیے یہ دریافت کیا کہ شمال سے تجارتی قافلہ آ رہا ہے اور جنوب سے قریش کا لشکر' تو ہمیں کس جانب کا قصد کرنا چاہیے؟ تو انہوں نے قافلے پر حملہ آور ہونے پر اصرار کیا۔ حالانکہ اللہ تو اس کے ذریعے حق کا بول بالا کرنے اور کافروں کی جڑ کاٹ دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اور دوسری طرف آیات ۹ تا ۱۴ میں ان خصوصی احسانات کا ذکر فرمایا گیا جو اُس معرکے کے دوران اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر کیے۔ جن میں اہل ایمان کی مدد کے لیے ملائکہ کی غیر مرئی فوج کا بھیجنا بھی شامل ہے اور معرکے سے ایک رات قبل بارانِ رحمت کا نزول بھی' جس سے اہل ایمان نے طہارت و پاکی بھی حاصل کی اور جس سے میدانِ جنگ میں ان کی جانب کے حصے میں ریت بھی دب گئی' جس سے قدم جما کر لڑنے کا امکان پیدا ہوا۔ مزید برآں جنگ سے پہلے والی رات اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے قلوب میں ایسا امن واطمینان پیدا کر دیا کہ وہ آرام سے سوئے اور اگلی صبح پوری طرح چاق و چوبند ہو کر میدانِ جنگ میں صف بستہ ہو گئے۔ اور آیت ۱۷ میں اس نصرت و تائید غیبی کا نتیجہ بیان کر دیا کہ اے مسلمانو! یہ جنگ اصل میں تم نے نہیں لڑی' ہم نے لڑی ہے' سردارانِ قریش کو تم نے قتل نہیں کیا' ہم نے کیا ہے اور نبی اکرم ﷺ نے جو کنکریوں کی مٹھی بھر کر کفار کی جانب پھینکی تھی' وہ انہوں نے نہیں' ہم نے پھینکی تھی۔ گویا بقول علامہ اقبال: ع

''ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ!''

(۲) ساتھ ہی پہلے آیات ۱۸' ۱۹ میں قریش کو متنبہ کر دیا کہ اگر تم حق و باطل کے فیصلے کے طالب تھے اور یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اللہ کی تائید و نصرت کس کے ساتھ ہے' تمہارے ساتھ یا محمد ﷺ اور اُن کے اصحاب کے ساتھ' تو وہ فیصلہ تمہارے سامنے آ چکا ہے۔ لہٰذا اب بھی باز آ جاؤ' اس میں بہتری اور خیریت ہے' بصورتِ دیگر جان لو کہ تمہاری جنگ محمد ﷺ اور اُن کے ساتھی مہاجرین وانصار سے نہیں اللہ سے ہے۔ اور پھر آیات ۳۲ تا ۳۸ میں اُن کے کان پھر کھول دیے گئے کہ ہجرت سے قبل ہماری ڈھیل کے باعث تمہارے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے' حتیٰ کہ تم کھلم کھلا عذاب تک کا مطالبہ کر گزرتے تھے' حالانکہ اُس وقت تک

ہمارے نبی تمہارے مابین موجود تھے۔ اب وہ امان اُٹھ چکی ہے لہٰذا عذاب کی پہلی قسط تمہیں مل گئی ہے۔ رہا تمہارا یہ خیال کہ تم بیت الحرام کے متولی اور مجاور ہو تو اس غرے میں بھی مت رہنا۔ تم نے توحید کے اس مرکز کی حرمت کو بھی اسے شرک کا گڑھ بنا کر بٹہ لگا دیا ہے اور اس کی تعمیر کے اصل مقصد یعنی نماز کے قیام کو بھی تم ضائع کر چکے ہو' یہاں تک کہ تم نے خود نماز کا حلیہ بگاڑ کر اُسے تالیوں اور سیٹیوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ لہٰذا اب تم اللہ سے کسی رعایت کی امید نہ رکھو' اور جان لو کہ اب تم خواہ کتنی ہی دولت صَرف کر لو اللہ کے دین کی راہ ہرگز نہ روک سکو گے۔

(۳) مسلمانوں کو دعوتِ اسلامی کے اس نئے مرحلے کے تقاضوں کے ضمن میں جو ہدایات دی گئیں وہ حسب ذیل ہیں:

اوّلاً ...... یہ جان لو کہ یہ جنگ جاری رہے گی جب تک کہ کفر و شرک کا کامل قلع قمع نہ ہو جائے اور دین کل کا کل صرف اللہ کے لیے نہ ہو جائے! (آیت ۳۹)

ثانیاً ...... جنگ کے لیے ہمیشہ تیار رہو اور اپنے جملہ وسائل کو بروئے کار لا کر زیادہ سے زیادہ اسلحہ اور سامانِ جنگ فراہم کرو۔ اس ضمن میں جو خرچ تم کرو گے اُس کا پورا پورا اجر تمہیں اللہ سے مل جائے گا۔ (آیت ۶۰)

ثالثاً ...... جن قبائل سے تمہارے معاہدے ہوں اُن کے معاہدوں کا لحاظ کرو' اگر وہ خیانت کا ارتکاب کریں گے تو اللہ اُن کے شر سے تمہیں بچائے گا۔ بہر صورت اگر تمہیں اُن کے خلاف اقدام کرنا ہی پڑے تو پہلے اُن کے معاہدے علی الاعلان اُن کے مُنہ پر دے مارو۔ بہر حال یہ صورت تمہارے شایانِ شان ہرگز نہیں ہے کہ کسی سے معاہدہ بھی ہو اور اس کے خلاف در پردہ یا کھلم کھلا اقدام بھی کیا جا رہا ہو۔ (یہ مضمون تفصیل کے ساتھ آیات ۵۶ تا ۵۸ اور ۶۱ تا ۶۴ میں آیا ہے)۔

رابعاً ...... جب دشمن سے مڈبھیڑ ہو ہی جائے تو میدانِ جنگ سے ہرگز مُنہ نہ موڑو' اِلّا یہ کہ خود جنگ کی مصلحتیں کسی باقاعدہ پسپائی کی متقاضی ہوں۔ جو کوئی صرف جان بچانے کی

غرض سے میدانِ جنگ سے فرار اختیار کرے گا اُس پر اللہ کا غضب نازل ہوگا اور اُس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ (آیات ۱۵،۱۶)۔ ساتھ ہی عین جنگ کے موقع پر بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو، بلکہ ذکر کا اہتمام کرو۔ (آیت ۴۵)۔

خامساً ......اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ تمہاری قوت کا اصل راز اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی بے چون و چرا اطاعت اور اُن کی پکار پر بلا پس و پیش حاضر ہو جانے میں مضمر ہے اور اسی میں حیاتِ حقیقی کا راز مضمر ہے خواہ بظاہر اس راہ میں موت کھڑی نظر آ رہی ہو۔ ساتھ ہی یہ تنبیہہ بھی کر دی گئی کہ ان اُمور میں ہر کوتاہی اصلاً اللہ اور رسولؐ کے ساتھ خیانت کے مترادف ہے اور اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ انسان اللہ کے قانون ہدایت و ضلالت کی زد میں آ جائے اور اس کے دل پر مہر لگا دی جائے کہ پھر راہِ ہدایت کی جانب پلٹنا ممکن ہی نہ رہے۔ (آیات ۲۰،۲۴،۲۷)

(۴) مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں جو اختلاف ہوا اُس کے ذیل میں نہایت حکیمانہ انداز یہ اختیار کیا گیا کہ پہلے تو آیت ۱ میں یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ یہ کل کا کل اللہ اور اُس کے رسول کا حق ہے۔ گویا دوسروں کو اس میں سے جو کچھ بھی مل جائے وہ اسے اللہ کا عطیہ سمجھیں نہ کہ اپنا حق۔ اس کے بعد آیت ۴۱ میں حتمی ضابطہ بیان کر دیا گیا کہ اموالِ غنیمت میں سے خمس یعنی پانچواں حصہ اسلامی حکومت کے خزانے میں جائے گا اور بقیہ کو مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ یہ بالکل وہی انداز ہے جو سورۃ البقرۃ میں تحویلِ قبلہ کے ضمن میں اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے فرمایا کہ:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾

''اور مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں۔ پس جدھر بھی تم رُخ کر لو، اللہ ہی کا رُخ ہے!''

اور اس طرح ذہنوں کو تبدیلی کے قبول کرنے کے لیے تیار کرنے کے بعد تحویل قبلہ کا حکم نازل فرما دیا گیا۔

(۵) ایک اور پیچیدہ مسئلہ جو جنگ کے بعد پیدا ہوا' وہ قیدیوں کا تھا۔اس کے ضمن میں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اختلافِ رائے پیدا ہوا اَزروئے فرمانِ نبویؐ اللہ کے دین کے معاملے میں اُمت محمد ﷺ کے سب سے زیادہ سخت گیر انسان یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے۔ان کی رائے یہ تھی کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے اور ہر مسلمان اپنے قریبی عزیز کو اپنے ہاتھوں قتل کرے' جب کہ رسول اللہ ﷺ کے قول کے مطابق اُمت پر سب سے بڑھ کر شفیق ورحیم انسان یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ اُن کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ خود رحمۃٌ للعالمین ﷺ کی رائے بھی لامحالہ اسی جانب تھی۔اس ضمن میں آیات ۶۷'۶۸ کی رُو سے وحیٔ الٰہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی موافقت میں نازل ہوئی۔اگرچہ اسیرانِ جنگ سے زرِفدیہ وصول کر کے رہا کر دینے کا جو فیصلہ آنحضور ﷺ فرما چکے تھے اسے برقرار رکھا گیا اور مسلمانوں کے اطمینان کے لیے آیت ۶۹ میں واضح الفاظ میں فرما دیا کہ خواہ عام اموالِ غنیمت ہوں خواہ اسیرانِ جنگ سے وصول شدہ زرِفدیہ' اسے پورے انشراحِ صدر کے ساتھ حلال وطیب جانتے ہوئے کھاؤ اور معاندین کے مخالفانہ پروپیگنڈے سے کوئی تأثر قبول نہ کرو کہ یہ نبی اور اس کے ساتھیوں کے شایانِ شان نہیں۔اس لیے کہ نبی اور اہل ایمان کے لیے کیا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں' اس کا فیصلہ اصلاً اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

تقریر نمبر ۱۰

سُورۃ التّوبۃ

سورۃ التوبۃ کا دوسرا مشہور نام سورۃ براءت ہے' یعنی وہ سورت جس میں مشرکین سے بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان کیا گیا ہے۔اور یہ بعض دوسرے ناموں سے بھی موسوم کی جاتی ہے' جیسے سورۂ مخزیہ' سورۂ فاضحہ' سورۂ مشردہ اور سورۂ عذاب' جو سب اس کی اسی صفت کی

جانب اشارہ کرتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مشرکین عرب کے لیے اس دنیا میں آخری ذلت ورسوائی اور عذابِ استیصال کا اعلانِ عام کیا گیا ہے۔ یہ اہم سورت مصحف میں دسویں پارے کے رُبع سے لے کر گیارھویں پارے کے رُبع سے آگے تک پھیلی ہوئی ہے اور ۱۶ رکوعوں اور ۱۲۹ آیات پر مشتمل ہے۔

مضمون کے اعتبار سے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک چھوٹا حصہ جو پہلے پانچ رکوعوں پر مشتمل ہے اور دوسرا بڑا حصہ جو بقیہ گیارہ رکوعوں پر مشتمل ہے۔ اور ان میں سے پھر ہر حصہ زمانۂ نزول کے اعتبار سے دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں نبی اکرم ﷺ کی دعوت کے سرزمین عرب کی حد تک تکمیلی مرحلے کا ذکر ہے، جبکہ دوسرا حصہ آپ ﷺ کی دعوت کے بیرونِ ملک یا بین الاقوامی مرحلے کے آغاز سے متعلق ہے۔

واضح رہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوتی سرگرمی کو آغازِ وحی اور حکمِ تبلیغ کے بعد تیرہ (۱۳ برس) یعنی ہجرت تک صرف مکے اور اُس کے اطراف و جوانب تک محدود رکھا، اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے آنحضور ﷺ کو مدینہ منورہ میں ایک چھوٹی سی شہری اسلامی ریاست عطا فرمادی اور اس طرح آپؐ کے لیے تمکن فی الارض کا سامان فراہم کر دیا تو آپؐ کی دعوت فطری طور پر دوسرے مرحلے میں داخل ہوگئی اور پورا جزیرہ نمائے عرب آپؐ کی دعوت و تبلیغ کا میدان بن گیا۔ ۶ ھ میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی اور اُس نے گویا ثابت کر دیا کہ اندرونِ عرب آنحضور ﷺ کو فیصلہ کن اور مسلّمہ طور پر غالب حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اسے ''فتح مبین'' قرار دیا۔ چنانچہ اب آپؐ نے بلاتاخیر ملوک وسلاطین کے نام دعوتی خطوط ارسال فرما کر اپنی دعوت کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز کر دیا، اور اس کے بعد سے آپؐ کی پیش قدمی بیک وقت دونوں محاذوں پر شروع ہوگئی، اندرونِ ملک عرب بھی اور بیرونِ ملک بھی۔ اندرونِ عرب کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ یہ دَور آنحضور ﷺ کے مشن کے اتمام و تکمیل کا دَور ہے، جب کہ بین الاقوامی سطح پر اسے آغاز و ابتداء سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اندرونِ ملک اتمام و تکمیل مقصد

بعثت نبویؐ کے اس عمل میں اہم مراحل کی حیثیت حاصل ہے ایک جانب فتح مکہ اور غزوۂ حنین کو اور دوسری جانب فتح خیبر کو اور بیرونِ ملک توسیعِ دعوت کے نتیجے میں واقع ہوا پہلے غزوۂ موتہ اور پھر سفر تبوک! سورۃ التوبۃ! اُسی دَور میں مختلف مواقع پر نازل شدہ خطبات پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اس کے پہلے پانچ رکوعوں میں زیر بحث آئے ہیں ایک جانب فتح صلح حدیبیہ‘ پھر مکہ کی جانب پیش قدمی‘ پھر غزوۂ حنین اور بالآخر قریش مکہ اور مشرکین عرب کے ضمن میں آخری اقدامات‘ اور دوسری جانب اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے بارے میں آخری فیصلہ۔ اور بقیہ گیارہ رکوع بحث کرتے ہیں تبوک کی مہم اور اُس کے دوران پیش آمدہ حالات و واقعات سے جن کے ضمن میں بالخصوص منافقین کا کردار نہایت تفصیل سے زیر بحث آیا‘ جس کے نتیجے میں اس سورۂ مبارکہ کو منافقین کے ضمن میں قولِ فیصل کی حیثیت بھی حاصل ہو گئی اور اس موضوع کے اعتبار سے قرآن مجید کے ذروۃ السنام کی بھی!

اس سورۂ مبارکہ کے پہلے حصے میں ربط و ترتیب کے ضمن میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ جس طرح سورۃ الانفال میں اموالِ غنیمت کے اہم مسئلے کو سورت کے درمیان سے نکال کر آغاز میں گویا بطور عنوان درج کر دیا گیا تھا اسی طرح اس سورۂ مبارکہ میں بھی مشرکین عرب سے اظہارِ بیزاری اور اعلانِ جنگ کو اس کی اہمیت کے پیش نظر درمیان سے نکال کر سورت کے عنوان کی حیثیت سے ابتدا میں درج کر دیا گیا ہے‘ ورنہ اصل ترتیب یہ ہے کہ اس سورت کے رکوع ۲‘ ۳ نزول کے اعتبار سے مقدم ہیں اور صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے قبل کسی موقع پر نازل ہوئے‘ جبکہ رکوع ۱‘ ۴‘ ۵ باہم مربوط ہیں اور اُن کا زمانۂ نزول ۸ ھ کا موسم حج ہے۔

دوسرے اور تیسرے رکوع کی آیات کے تاریخی پس منظر کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے‘ اور وہ یہ کہ صلح حدیبیہ کا اثر عرب کے تمام قبائل پر یہ پڑا کہ اب جبکہ عرب کی سب سے بڑی قوت یعنی قریش نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں‘ تو عافیت اسی میں ہے کہ جلد از جلد سب ہی آنحضور ﷺ سے مصالحت کی کوئی صورت پیدا کر لیں۔ اُدھر آنحضور ﷺ کا دستِ مبارک حالات کی نبض پر تھا اور آپؐ ڈیڑھ دو سال قبل غزوۂ احزاب کے بعد ہی واضح فرما چکے تھے

کہ اب مشرکین اور کفار میں قوتِ مقاومت موجود نہیں ہے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ ان سے معاہدے کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ کفر اور شرک کو خواہ مخواہ مزید مہلت دی جائے اور اللہ کے دین کے غلبے کی تکمیل کو بلاوجہ مؤخر کیا جائے۔ اِدھر یہ بات بھی بادنیٰ تامل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ صلح جو اور امن پسند لوگ ہر معاشرے اور جماعت میں موجود ہوتے ہیں اور بالخصوص مسلمانوں کی تو غالب اکثریت کا اسی مزاج کا حامل ہونا عین قرین قیاس ہے۔ ایسے حضرات کے لیے معاہدے کی کسی بھی پیش کش کو کسی بھی صورت میں رد کرنا ناقابل قیاس ہوتا ہے اور اصل میں یہی عقدہ ہے جسے سورۃ التوبۃ کے دوسرے رکوع میں کھولا گیا ہے کہ اوّل تو شرک و توحید اور حق و باطل کے مابین بقائے باہمی (peaceful co-existance) کا کوئی تصور ویسے ہی خارج از بحث ہے۔ ثانیاً تم ان مشرکین کے الفاظ کے بجائے اُن کے کردار کو دیکھو اور اُن کی چکنی چپڑی باتوں پر نہ جاؤ' بلکہ ان کے اب تک کے کرتوتوں کو یاد کرو! کیا یہ وہی نہیں ہیں جنہوں نے حق کی راہ روکنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا اور اس معاملے میں نہ کسی قرابت کا کوئی لحاظ کیا نہ کسی قول وقرار یا عہد و ذمہ کا۔ پھر کیا یہی نہیں ہیں جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کو مکہ سے نکالا اور پھر مدینہ میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ اب جبکہ حالات کا پانسہ پلٹ گیا ہے تو وہ معاہدوں کی چھاؤں میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ ان کے فریب میں مت آؤ اور اُن سے قتال کرو۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اُن کے کفر و اعراض کی سزا تمہارے ہاتھوں دے گا اور ان مسلمانوں کے قلوب کو ٹھنڈک عطا فرمائے گا جو اُن کے مظالم کی چکیوں میں پستے رہے ہیں۔ اس ضمن میں ایک اشکال اور بھی تھا اور وہ یہ کہ اہل عرب کے قلوب و اذہان میں حرم اور متولیانِ حرم یعنی قریش کی عظمت کا جو نقش صدیوں کے تعامل کے باعث قائم ہو چکا تھا' وہ بھی کسی فیصلہ کن اقدام کی راہ میں حائل تھا۔ چنانچہ تیسرے رکوع میں اس نفسیاتی الجھن کا حل کیا گیا ہے کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا یا اُن کے متولی بننا مشرکین کا حق ہے ہی نہیں۔ یہ حق تو اصلاً صرف اہل ایمان وتوحید کا ہے۔ گویا مشرکینِ مکہ کی حیثیت غاصبین کی ہے اور صرف حجاج بیت اللہ الکرام کی خدمت یا مسجد حرام

کے متولی ہونے سے اُنہیں کوئی ایسا تقدس حاصل نہیں ہوتا جو اُن کے خلاف کسی اقدام میں مانع ہو سکے......اس طرح یہ دونوں رکوع گویا تمہید ہیں اس فیصلہ کن اقدام کی جس کے نتیجے میں بفضلہٖ تعالیٰ رمضان ۸ ھ میں مکہ فتح ہوا' اور پھر اگلے ہی ماہ معرکۂ حنین میں کفر اور شرک کی کمر توڑ کر رکھ دی گئی۔

اس ضمن میں مسلمانوں کی جماعت کے ففتھ کالمسٹ عنصر یعنی منافقین کے نفاق کا پردہ بھی چاک کر دیا گیا۔ یہ لوگ موت کے خوف کے باعث جنگ وقتال سے تو گریزاں رہتے ہی تھے' اب ایک نیا مرحلۂ امتحان یہ پیش آیا کہ حق کی تلوار اہل کفر و شرک سے رشتہ داریوں' قرابتوں' محبتوں' دوستیوں اور در پردہ تعلقات کے بندھنوں کو کاٹنے کے لیے بے نیام ہوا چاہتی تھی۔ چنانچہ اوّلاً آیت ۱۶ میں واشگاف الفاظ میں فرما دیا گیا:

''کیا تم نے یہ سمجھا تھا کہ یونہی چھوڑ دیے جاؤ گے' حالانکہ ابھی تو اللہ نے دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ہیں وہ لوگ جو جہاد کا حق ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسول اور اہل ایمان کے سوا کسی سے کوئی دلی تعلق نہیں رکھتے!''

اور پھر آیت ۲۴ میں کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف اعلان کر دیا:

''کہہ دو (اے نبیؐ!) کہ اگر تمہیں اپنے والد' اپنے بیٹے' اپنے بھائی' اپنی بیویاں اور اپنے اعزہ واقرباء اور وہ مال جو تم نے جمع کیے ہیں اور وہ کاروبار جن کے مندے کا خوف تمہیں لاحق رہتا ہے اور وہ مکان جو تمہیں بہت پسند ہیں' عزیز تر ہیں اللہ سے اور اُس کے رسول سے اور اُس کی راہ میں جہاد سے' تو جاؤ انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہرگز راہ یاب نہیں کرتا!''

فتح مکہ کے فوراً بعد ۸ ھ کا حج آنحضور ﷺ نے سابق انتظام ہی کے تحت ہونے دیا۔ اگلے سال یعنی ۹ ھ کے حج کے لیے آنحضور ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امارت میں قافلۂ حج کو روانہ فرما چکے تھے کہ سورۃ التوبۃ کی وہ چھ آیات نازل ہوئیں جو اِس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں درج ہیں اور جن میں مشرکین سے اعلان براءت بھی کر دیا گیا اور حج کے موقع پر اس اعلانِ عام کا حکم بھی دے دیا گیا کہ حرمت والے مہینوں کے ختم ہوتے ہی مشرکین

عرب کے خلاف آخری اقدام شروع کر دیا جائے گا بفحوائے الفاظِ قرآنی:

''پس جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کرو اور انہیں پکڑو' گھیرو اور ہر گھات کی جگہ اُن کی تاک لگاؤ۔ پھر اگر یہ توبہ کر لیں' نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انہیں چھوڑ و!'' (آیت ۵)

چنانچہ آنحضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ آپؐ کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے حج کے اجتماع میں یہ اہم اعلان کر دیں۔ اوراس طرح گویا جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اللہ کے دین کے غلبے کی تکمیل کے بعد مشرکین کے خلاف جنگی اصطلاح میں آخری mopping up operation شروع ہو گیا اور مشرکین عرب کے ضمن میں اس عذابِ الٰہی کی تکمیل ہو گئی جس کا آغاز غزوۂ بدر سے ہوا تھا۔

سورۃ التوبۃ کے چوتھے اور پانچویں رکوع کی آیات بھی اغلباً متذکرہ بالا آیات سے متصل ہی نازل ہوئیں اور ان میں ایک تو وارد ہوئی وہ اہم آیت جو قرآن مجید میں دو اور مقامات پر یعنی سورۃ الفتح اور سورۃ الصّف میں وارد ہوئی ہے اور جس میں آنحضور ﷺ کے مقصد بعثت کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے' یعنی:

''وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تا کہ غالب کر دے اسے تمام ادیان (یا پورے جنسِ دین) پر' خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو!''

اور دوسرے اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے ساتھ بھی عام اعلانِ جنگ کر دیا گیا صرف اس رعایت کے ساتھ کہ اُن کے لیے اسلام اور تلوار کے علاوہ ایک تیسری صورت بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ اسلامی ریاست کے ماتحت ہو کر زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں اور مغلوب ہو کر جزیہ ادا کریں۔ گویا قانونِ ملکی یعنی (law of the land) اسلام ہی کا ہو گا' اس کے تحت personal law کی حد تک وہ اپنے طور طریقوں کے مطابق زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ آئندہ کے لیے یہی ضابطہ مسلمانوں کا مستقل دستور العمل قرار پایا اور خلافت راشدہ کے دوران جب اسلامی افواج جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکلیں تو اُن کی جانب سے

ہمیشہ یہی تین صورتیں پیش کی جاتی رہیں کہ ایمان لے آؤ' ہمارے بھائی اور ہر اعتبار سے برابر ہو جاؤ گے' ورنہ اسلام کی بالا دستی قبول کر لو اور جزیہ ادا کرو' تمہیں جان و مال کا مکمل تحفظ مل جائے گا' بصورتِ آخر میدان میں آؤ' تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ چوتھی کوئی صورت موجود نہیں ہے!

آنحضورﷺ کی دعوت کے بین الاقوامی مرحلے کا آغازِ صلح حدیبیہ کے بعد سلاطین و ملوک کے نام دعوتی خطوط سے ہوا۔ بدبخت والیٔ ایران خسرو پرویز نے آنحضورﷺ کے نامۂ مبارک کو چاک کر دیا۔ قیصر روم چونکہ عیسائی تھا لہٰذا اسے آنحضورﷺ کو پہچاننے میں قطعاً دیر نہ لگی' لیکن اس نے کوشش کی کہ جس طرح پہلے سلطنتِ روما نے اجتماعی طور پر عیسائیت قبول کی تھی اسی طرح اب بھی اجتماعی طور پر اسلام لے آیا جائے تاکہ پورا نظامِ مملکت جوں کا توں قائم رہ سکے۔ لیکن اسے اس میں کامیابی نہ ہوئی اور اس طرح وہ خود بھی دولتِ ایمان اور نعمتِ اسلام سے محروم رہ گیا۔ عزیز مصر بھی اگرچہ ایمان تو نہ لایا تاہم اس نے آنحضورﷺ کے ساتھ اعزاز و اکرام کا معاملہ کیا۔ سب سے زیادہ اشتعال انگیز معاملہ والیٔ بصریٰ شرحبیل بن عمرو نے کیا کہ آپﷺ کے ایلچی کو قتل کر دیا' جس کے نتیجے میں پہلے جمادی الاولیٰ ۸ ھ میں غزوۂ موتہ واقع ہوا اور پھر اگلے ہی سال یعنی ۹ ھ میں تبوک کی مہم پیش آئی۔ یہ مرحلہ اسلام اور اہل ایمان کے لیے واقعتاً نہایت کٹھن تھا' اس لیے کہ جنگ وقت کی عظیم ترین عسکری قوت سے تھی اور بظاہر احوال معاملہ ممولے اور شہباز کی لڑائی کا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ عرب میں اجناس کی سخت قلت تھی اور قحط کا عالم تھا اور اب کھجور کی فصل تیار تھی اور اندیشہ تھا کہ اگر بروقت اُتاری نہ گئی تو یہ بھی تباہ ہو جائے گی۔ ادھر موسم انتہائی سخت گرمی کا تھا۔ الغرض اللہ تعالیٰ کی جانب سے اہل ایمان کے جذبۂ ایمانی کے امتحان کا بھرپور سامان کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ جس جس کے دل میں کوئی روگ تھا' یا نفاق جڑ پکڑ چکا تھا یا جذباتِ ایمانی میں ادنیٰ درجے کا اِضمحلال بھی پیدا ہو گیا تھا اُن سب کا معاملہ ظاہر ہو گیا۔ اندریں حالات سفر پر روانگی سے قبل' سفر کے دوران اور پھر واپسی پر جو حالات و واقعات پیش آئے

اور اُن پر تبصروں کے طور پر جو خطباتِ الٰہی آیاتِ قرآنی کی صورت میں نازل ہوئے' اُن میں ایمان' ضعفِ ایمان اور نفاق تینوں کے اوصاف و خصائص کی کامل وضاحت ابدالآباد تک کے لیے کر دی گئی --- صادق الایمان لوگوں کے لیے تو جیسا کہ سورۃ الانفال میں واضح کر دیا گیا تھا' اس کے سوا کوئی راہ ہے ہی نہیں کہ وہ اللہ اور رسول کی ہر پکار پر فوراً لبیک کہیں اور نہ کسی تعلق دُنیوی کو راستے میں حائل ہونے دیں نہ کسی خوف یا خطرے یا اندیشے کو' اور اگر کوئی انہیں خطرات سے ڈرائے تو ان کا جواب یہ ہو کہ:

"کہہ دو ہم پر کوئی چیز وارد نہیں ہو سکتی سوائے اس کے جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہو۔ وہ ہمارا مولیٰ ہے اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے اہل ایمان کو۔ کہہ دو کہ تم ہمارے بارے میں دو بھلائیوں کے سوا آخر اور کس چیز کی توقع کر سکتے ہو (یعنی ہم سب شہید ہو جائیں تب بھی ہمارے نزدیک تو یہ سب سے بڑی کامیابی ہے اور اگر کامیاب لوٹ آئیں تو اسے تو تم بھی کامیابی قرار دو گے)۔" (التوبۃ: ۵۱'۵۲)

یہ اس لیے کہ بفحوائے الفاظِ آیت ۱۱۱:

"اللہ تعالیٰ اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے جملہ اموال پہلے ہی جنت کے عوض خرید کر چکا ہے۔"

گویا ایک مؤمن صادق تو منتظر ہوتا ہے کہ اب جو یہ جان و مال اللہ کی امانت کے طور پر اس کے پاس ہیں' کب اللہ انہیں وصول فرمالے اور وہ امانت کے اس بارِ گراں سے سبکدوش ہو جائے ---- رہے کسی سبب سے وقتی طور پر ضعفِ ایمان میں مبتلا ہو جانے والے لوگ تو تین انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم کی سرگزشت کے ذریعے واضح کر دیا گیا کہ ایسے لوگوں سے جب کوئی تقصیر ہو جاتی ہے تو وہ جھوٹے بہانے نہیں بناتے' بلکہ اپنا قصور تسلیم کر لیتے ہیں اور اصلاح کی کوشش کرتے ہیں' چنانچہ اللہ بھی انہیں توبہ کی توفیق عطا فرماتا ہے اور بالآخر اُن کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس ہے معاملہ منافقین کا۔ یہ اپنی کوتاہیوں پر جھوٹے بہانوں' حتیٰ کہ جھوٹی قسموں کا پردہ ڈالتے ہیں اور رفتہ رفتہ انہیں وہ لوگ برے لگنے لگتے ہیں جو اللہ اور اس کے دین کے غلبے کے لیے جان و مال کی بازیاں کھیل رہے ہوں۔ اس

لیے کہ اس طرح اُن کی بے عملی اور بزدلی مزید نمایاں ہوتی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ انہیں اسلام و ایمان اور مسلمین قانتین اور مؤمنین صادقین سے دشمنی اور عداوت ہو جاتی ہے اور تب اُن کے دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ اور ان کی محرومی اور بدبختی اس درجہ کو پہنچ جاتی ہے کہ اُن کے حق میں نبی کا استغفار بھی مفید نہیں رہتا' بفحوائے الفاظ قرآنی:

> ''(اے نبیؐ!) آپ خواہ ان کے لیے استغفار کریں خواہ نہ کریں' اگر آپ ان کے لیے ستر بار استغفار کریں تب بھی اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں فرمائے گا' یہ اس لیے کہ انہوں نے درحقیقت اللہ اور اُس کے رسولؐ دونوں کا کفر کیا ہے' اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا!'' (آیت:۸۰)

اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ ذٰلِكَ!

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ!

تیسرا گروپ

سورۂ یونس تا سورۃ النور

تقریر نمبر ۱۱

سورۂ یونس و سورۂ ھود

قرآن حکیم میں گیارہویں پارے میں سورۂ یونس سے لے کر اٹھارہویں پارے میں سورۃ المؤمنون تک ۱۴ مکی سورتوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں مضامین اور ربط کلام کے اعتبار سے اکثر سورتیں تو جوڑوں کی شکل میں ہیں لیکن بعض بالکل منفرد مزاج کی حامل ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ثانوی اعتبار سے کسی جوڑے ہی کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس طرح بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بڑے گروپ میں تین تین سورتوں پر مشتمل چھوٹے گروپ تشکیل پا گئے ہیں، جن میں مضامین کی بڑی مناسبت و مشابہت پائی جاتی ہے۔

ان میں سے پہلا گروپ سورۂ یونس، سورۂ ھود اور سورۂ یوسف پر مشتمل ہے، جن میں سے سورۂ یونس اور سورۂ ھود میں تو بعینہٖ وہی نسبت باہمی پائی جاتی ہے جو ہم اس سے قبل سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف میں دیکھ چکے ہیں۔ البتہ سورۂ یوسف بالکل منفرد سورت ہے جس میں از اوّل تا آخر صرف ایک نبی یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات و واقعات تفصیلاً بیان ہوئے (اس کی ایک ہی اور مثال پورے قرآن میں سورۂ طٰہٰ کی ہے، جس میں اسی طرح از ابتدا تا انتہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات کا ذکر ہے)۔

سورۂ یونس اور سورۂ ھود دونوں مکی دَور کے اواخر میں نازل ہوئیں اور غالباً سورۂ ھود، سورۂ یونس سے قبل نازل ہوئی۔ ان دونوں اور بالخصوص سورۂ ھود کے مضامین کا انداز ایسا ہے جیسے عذابِ الٰہی آیا چاہتا ہو اور ہلاکت اور بربادی کے سیلاب کا بند بس ٹوٹنے والا

ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ ان سورتوں کے نزول کے زمانے میں آنحضور ﷺ صدمے کے باعث بوڑھے نظر آنے لگے تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے استفسار پر آپؐ نے فرمایا بھی کہ: ((شَيَّبَتْنِي هُودٌ وَأَخَوَاتُهَا)) ''مجھے ہود اور اس کی ہم مضمون سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔''

سورۂ یونس اور سورۂ ہود کے مابین جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' وہی نسبت ہے جو سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف میں ہے کہ ایک میں ''**تذکیر بآلاء اللّٰہ**'' پر زیادہ زور ہے اور دوسری میں ''**تذکیر بایام اللّٰہ**'' پر۔ چنانچہ سورۂ یونس کے گیارہ رکوعوں میں سے صرف دو میں قصص المرسلین کا ذکر ہے اور بقیہ پوری سورت میں آفاق وانفس کے دلائل اور فطرت کی بدیہی شہادتوں سے توحید' معاد اور رسالت کو مبرہن کیا گیا ہے' جبکہ سورۂ ہود کے دس رکوعوں میں سے سات میں رُسولوں کے حالات اور ان کی قوموں پر عذاب کی تفاصیل بیان ہوئی ہیں اور صرف تین رکوعوں میں اصولی مباحث وارد ہوئے ہیں۔ جن رسولوں کا ذکر ان دونوں سورتوں میں ہوا یہ وہی چھ ''اُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ'' ہیں جن کا ذکر سورۃ الاعراف میں آ چکا ہے' یعنی حضراتِ نوح' ہود' صالح' لوط' شعیب وموسیٰ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام۔ ان کے علاوہ صرف ایک رسول یعنی حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر سورۂ یونس میں مزید آیا ہے' لیکن وہ بالکل ضمنی طور پر ---- پھر سورۂ یونس اور سورۂ ہود کے مابین یہ عکسی ترتیب بھی بڑی دلچسپ ہے کہ سورۂ یونس میں ان چھ رسولوں میں سے آخری یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر نہایت مفصل ہوا اور پہلے یعنی حضرت نوح علیہ السلام کا مجملاً ---- اور بقیہ چار کے صرف مجموعی ذکر پر اکتفا کیا گیا' جب کہ سورۂ ہود میں حضرت نوحؑ کا ذکر بہت مفصل ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نہایت مجمل' اور بقیہ چار کے ذکر کے لیے بھی پورا پورا ایک رکوع وقف کیا گیا۔

اولوالعزم رسولوں کے اس ذکر کی اصل اور نمایاں غرض تو ظاہر ہے کہ مشرکین عرب بالخصوص قریش مکہ کو انذار یعنی خبردار کرنا ہے کہ جس طرح تمہارے پاس ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ آئے ہیں اسی طرح ہم نے تمہارے ملک اور اس کے اطراف و جوانب میں سابق اقوام کے پاس بھی اپنے رسول علیہم السلام بھیجے تھے' اور جس طرح تم ان کا انکار کر رہے

ہواور بجائے ایمان کے کفر و اعراض کی روش اختیار کر رہے ہو اسی طرح انہوں نے کیا تھا۔ تو تم جانتے ہی ہو کہ ان کو ہم نے کیسے نیست و نابود اور نسیاً منسیاً کر دیا ------ تو اب خود غور کر لو کہ تم اپنے آپ کو کس انجام کا مستحق بنا رہے ہو!

دوسرا اہم پہلو اس میں آنحضور ﷺ اور آپؐ کے ساتھی اہل ایمان کے لیے تبشیر کا ہے کہ جس طرح سابقہ رسولوں اور ان کے ساتھیوں پر مصائب آئے اور اُن کا استہزاء بھی کیا گیا اور اُن پر تشدد بھی کیا گیا' لیکن بالآخر کامیاب وہی ہوئے اور اللہ کی تائید و نصرت ان کے شامل حال ہوئی' اسی طرح بالآخر کامیاب تم ہی رہو گے۔ البتہ اہل ایمان کے صبر و ثبات اور عزم و ہمت کا امتحان اللہ ضرور لیا کرتا ہے۔ اس کے لیے تمہیں بھی تیار رہنا چاہیے۔

چنانچہ سورۂ یونس کا اختتام ہوا ان الفاظ پر کہ:

﴿وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝﴾

''اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ صادر فرما دے' اور اللہ ہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔''

اور سورۂ ہود کے آخر میں پہلے آیت ۱۱۵ میں فرمایا:

''اور صبر کرو' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خوب کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

اور پھر آیت ۱۲۰ تا ۱۲۳ میں فرمایا:

''اور اِن رسولوں کی تمام سرگزشتیں ہم تمہیں اس لیے سنا رہے ہیں کہ ان کے ذریعے (اے نبیؐ!) ہم تمہارے دل کو تقویت دیں' چنانچہ ان میں تمہارے لیے بھی حق الیقین مضمر ہے اور اہل ایمان کے لیے بھی نصیحت اور یاد دہانی۔ اور جو لوگ ایمان نہیں لا رہے ان سے ڈنکے کی چوٹ کہہ دو کہ تم اپنی سی کیے جاؤ' ہم بھی پورا زور صرف کریں گے' پھر نتیجے کا انتظار تم بھی کرو اور ہم بھی منتظر ہیں اور آسمانوں اور زمین کا غیب تو صرف اللہ ہی کے پاس ہے اور اسی کی طرف تمام امور فیصلے کے لیے لوٹتے ہیں۔ پس اسی کی بندگی کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو تمہارا رب اس سے بے خبر ہرگز نہیں ہے!''

سورۂ یونس میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ

مسلمان حضرت یونسؑ کی طرح جلدی میں کوئی اقدام کر بیٹھیں تو اس کا فائدہ تمام تر کفار کو ہو گا' جیسا کہ حضرت یونسؑ کی قوم کو ہوا کہ ان پر آیا ہوا عذاب ٹل گیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ مسلمان اللہ کی طرف سے کسی تادیبی سلوک کے مستحق ٹھہریں۔ جیسا کہ معاملہ ہوا تھا حضرت یونسؑ کے ساتھ! پس مسلمانوں کو کفار کی تعذیب و ایذاء پر صبر کرتے ہوئے اپنی دعوت و تبلیغ کا کام جاری رکھنا چاہیے اور فیصلہ تمام تر اللہ کے حوالے کر دینا چاہیے!

ایمانیاتِ ثلٰثہ یعنی توحید' معاد اور رسالت میں سے ان دونوں سورتوں میں اصل زور رسالت کے اثبات اور بالخصوص آنحضور ﷺ کی نبوت کے ثبوت کے طور پر قرآن مجید کے اعجاز پر دیا گیا ہے۔ چنانچہ دونوں سورتوں کا آغاز قرآن حکیم کے ذکر ہی سے ہوتا ہے۔ سورۂ یونس میں اختصار کے ساتھ کہ:

﴿الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ①﴾

''ا۔ل۔ر۔ یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔''

پھر سورۂ ہود میں کہ:

﴿الٓـرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ①﴾

''ا۔ل۔ر۔ یہ قرآن ایسی کتاب ہے جس کی آیات پہلے محکم کی گئیں اور پھر ان کی تفصیل کی گئی اس ہستی کی جانب سے جو کمال حکمت کی حامل اور ہر چیز سے باخبر ہے!''

مزید برآں دونوں سورتوں میں قرآن مجید کے ضمن میں چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر تم اس کے بارے میں شک کرتے ہو کہ یہ محمد ﷺ کی اپنی تصنیف ہے تو ذرا تم بھی طبع آزمائی کر دیکھو اور تمام خطیبوں' شاعروں اور ادیبوں کو جمع کر کے کوشش کرو کہ اس جیسی دس بلکہ ایک ہی سورت تصنیف کر سکو' چنانچہ سورۂ ہود میں فرمایا:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ⑬ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ

مُّسْلِمُوْنَ﴿۱۴﴾

''کیاان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ اسے تم نے خود گھڑ لیا ہے؟ تو کہہ دو کہ لاؤ اس جیسی دس سورتیں گھڑی ہوئی اور اللہ کے سوا جسے چاہو مدد کے لیے بلا لو اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر وہ تمہارا یہ چیلنج قبول نہ کریں تو یقین کرنا چاہیے کہ یہ اللہ کے علم ہی سے نازل ہوا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں' تو اب بھی اسلام لاتے ہو یا نہیں۔''

اور سورۂ یونس میں اس چیلنج کو آخری منطقی حد تک پہنچا دیا کہ:

﴿وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (آیت ۳۷)

''اور یہ قرآن ہرگز ایسی کتاب نہیں ہے کہ خدا کے سوا کوئی اور اسے تصنیف کر سکے۔''

اور یہ کہ:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴿۳۸﴾﴾

''کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ پیغمبر نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ تو کہہ کہ اگر تم سچے ہو تو خدا کے سوا جس کو بھی بلا سکو بلا لو اور سب مل کر اس جیسی ایک ہی سورت پیش کر کے دکھا دو!''

اس کے علاوہ دونوں ہی سورتوں میں یہ مضمون بھی وارد ہوا ہے کہ کفار و مشرکین نے تھک ہار کر مصالحت کی غرض سے یہ تجویز پیش کی کہ اس قرآن میں قدرے ترمیم کر دو تو ہم تسلیم کر لیں گے' اس خیال سے کہ بالفرض کسی امن پسند اور صلح جُو شخص کے دل میں ان کے اس دامِ ہم رنگِ زمیں کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا ہو جائے۔ سورۂ ہود میں بظاہر آنحضور ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے لیکن اصلاً بطرزِ تعریض کفار کو ملامت کرتے ہوئے فرمایا:

''تو شاید کہ تم اپنی جانب کی گئی وحی میں سے کچھ کو ترک کر دو گے اور تمہارا سینہ ان کے اس قول پر بھنچ کر رہ جاتا ہے کہ ان پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا یا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہ آیا۔ تو جان لو کہ تمہارا کام صرف خبردار کر دینا ہے' باقی ہر چیز کا اصل ذمہ دار اللہ ہے!'' (آیت ۱۲)

اور سورۂ یونس میں فرمایا:

''جب ان کو ہماری آیاتِ بینات سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہمارے حضور میں حاضری کا یقین نہیں وہ کہتے ہیں کہ یا تو اس کے علاوہ کوئی اور قرآن پیش کرو یا اس میں ترمیم کرو۔ کہہ دو! میرے لیے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے جی سے اس میں تغیر وتبدل کر سکوں، میں تو خود پابند ہوں اس کا جو میری جانب وحی کیا جاتا ہے۔ اور اگر میں نے اپنے ربّ کی نافرمانی کی تو خود مجھے بھی اپنے ربّ سے بڑے دن کی سزا کا خوف ہے!'' (آیت ۱۵)

اور یہی ہے وہ بات جو سورۂ یونس کے اختتام پر آنحضورﷺ سے خطاب کر کے فرمائی گئی کہ:

''اور اتباع کیے جاؤ اس کا جو تمہاری طرف وحی کیا جا رہا ہے۔'' (آیت ۱۰۹)

اور آیات ۵۷، ۵۸ میں یہ بات خطابِ عام کے انداز میں فرمائی گئی کہ:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾

یعنی ''لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت، سینوں کے امراض کی شفا اور اہل ایمان کے لیے ہدایت ورحمت آ گئی ہے۔ کہہ دو کہ اللہ کے فضل کا کرشمہ اور اس کی رحمت کا ظہور ہے تو چاہیے کہ لوگ اس پر شاداں وفرحاں ہوں۔ اس لیے کہ یہ ان سب چیزوں سے بہت بہتر اور قیمتی ہے جنہیں یہ جمع کر رہے ہیں!''

آنحضورﷺ کی نبوت ورسالت اور قرآن مجید کے ذکر کے بعد سب سے نمایاں مضمون ان دونوں سورتوں میں انذار کا ہے جس میں اس مرحلے کی مناسبت سے جس میں یہ نازل ہوئی ہیں، کافی شدت اور غضبنا کی کا انداز پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان میں ایک جانب سورۃ الکافرون کا سا اعلان براءت بھی موجود ہے، جیسے سورۂ یونس کی آیت ۴۱ میں فرمایا:

''اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ بھی کہہ دیں کہ میرے لیے ہے میرا عمل اور تمہارے لیے ہے تمہاری کمائی، تم بری ہو میرے اعمال سے اور میں بری ہوں تمہارے کرتوتوں سے۔''

اور آیت ۱۰۴ میں فرمایا:

''کہہ دو اے لوگو! اگر تمہیں میرے موقف کے بارے میں کوئی شک ہے تو سن رکھو کہ میں ہرگز پوجنے والا نہیں ہوں جنہیں تم پوجتے ہو اللہ کے سوا' میں تو اس اللہ کا پوجنے والا ہوں جو تمہاری جانیں قبض کرے گا اور مجھے تو یہی حکم ہوا ہے کہ اس پر ایمان رکھنے والوں میں شامل رہوں!''

اور دوسری طرف عذاب کی بھی شدید دھمکی پائی جاتی ہے' مثلاً سورۂ یونس کی آیات ۴۷ تا ۵۳ میں فرمایا:

''اور ہر اُمت کے لیے ایک رسول ہوتا ہے' تو جب اُن کا رسول آ جاتا ہے تو ان کا قضیہ انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ ہمارے بارے میں کب پورا ہوگا۔ کہہ دو کہ جہاں تک میرا تعلق ہے تو مجھے تو خود اپنے نفع ونقصان کا بھی کوئی اختیار حاصل نہیں' سوائے اس کے کہ اللہ ہی جو چاہے (اُس کا فیصلہ صادر ہو جائے)۔ البتہ ہر قوم کے لیے ایک متعین وقت ہوتا ہے' تو جب اُن کا وہ متعین وقت آ جاتا ہے تو نہ وہ ایک گھڑی پیچھے سرک سکتے ہیں نہ آگے۔ ان مجرموں سے کہو کہ اگر اللہ کا عذاب رات کو آئے یا دن کے وقت' آخر ان کے پاس حفاظت کا وہ کون سا سامان ہے جس کے بھروسے پر عذاب کی جلدی مچائے جا رہے ہیں۔ تو اے لوگو! کیا تم اُس وقت مانو گے جب عذابِ الٰہی آ ہی دھمکے گا؟ اُس وقت ان ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ماننے سے کیا فائدہ' جبکہ پہلے تم اس کے لیے جلدی مچاتے رہے' اب تو بس ہمیشگی عذاب ہی کا مزا چکھو' یہ تمہاری اپنی کمائی ہے جس کا بدلہ تم پا رہے ہو۔ اور یہ آپ سے پوچھتے ہیں کیا واقعی شدنی ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ کہہ دو ہاں' میرے ربّ کی قسم! یہ اٹل ہے اور (جب وہ آئے گا تو) تم اُس کو ہرگز نہ روک سکو گے (اُس کے قابو سے باہر نہ نکل سکو گے)!''

کفار و مشرکین کو انذار کے ساتھ ساتھ ان دونوں سورتوں میں اہل ایمان کے لیے تبشیر کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس کی دوسری آیت ہی میں جہاں حضور ﷺ کو یہ حکم ہوا کہ لوگوں کو ان کی بدعملی و بدکرداری کے انجام سے خبردار کر دو' وہاں ساتھ یہ ہدایت بھی ملی کہ

اہل ایمان کو بشارت دے دو کہ:

﴿اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾

''کہ ان کے لیے اُن کے ربّ کے پاس بڑا بلند رُتبہ ہے۔''

اور پھر اسی سورت کی آیات ۹' ۱۰ میں اس کی تشریح فرما دی:

''یقیناً جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اللہ اُن کو اُن کے ایمان کی بدولت اُن کی منزلِ مراد تک پہنچا دے گا' یعنی نعمت کے باغوں میں جن کے دامن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور وہاں ان کا ترانہ ہو گا حمد باری تعالیٰ پر مشتمل' اور آپس کا دعائیہ کلمہ ہو گا سلام! اور آخری بات ان کی یہی ہو گی کہ ساری تعریف اور تمام شکر اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالن ہار ہے۔''

اور آیات ۶۲ تا ۶۴ میں فرمایا کہ:

''آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف کا مقام ہے اور نہ رنج کا اندیشہ' یعنی ان کے لیے جو ایمان لائے اور تقویٰ پر کاربند رہے' ان کے لیے بشارتیں ہی بشارتیں ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی' اللہ کی باتوں کا بدلنے والا کوئی نہیں' یہی عظیم کامیابی ہے!''

اللہ تعالیٰ اپنے کمال فضل و کرم سے ہمیں بھی اس میں سے حصہ عطا فرمائے!

آمِيْنَ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ!

تقریر نمبر ۱۲

سورۂ یوسف

سورۂ یوسف جو قرآن مجید میں بارہویں پارے کے ثلثہ سے قبل شروع ہوتی ہے۔ اور تیرھویں پارے کے ربع کے بعد ختم ہوتی ہے' ۱۱۱ آیات اور ۱۲ رکوعوں پر مشتمل ہے۔ اور اس میں سوائے ابتدائی دو اور آخری دس آیات کے از اوّل تا آخر ایک ہی نبی یعنی حضرت

یوسف علیہ السلام کے حالات و واقعات بیان ہوئے ہیں۔قرآن حکیم میں اس کی کامل مثال تو ایک ہی اور ہے' یعنی سورۂ طٰہٰ' البتہ قریبی مثال ایک اور بھی ہے' یعنی سورۃ القصص۔اور یہ دونوں اسی طرح کل کی کل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات پر مشتمل ہیں' اور عجب اتفاق ہے کہ ان دونوں کا گہرا تعلق بنی اسرائیل کی تاریخ سے ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں یہ مصر میں داخل ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں اُن کا مصر سے نکلنا ہوا۔

مزید برآں ان دونوں کے حالات میں بھی ایک عجیب مشابہت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اُن کے اپنے بھائیوں نے حسد کی بنا پر کنوئیں میں ڈالا۔لیکن اللہ نے اپنے فضل سے انہیں مصر ایسے متمدن ملک کے دارالحکومت میں نہایت سربرآوردہ گھرانے میں پہنچا دیا۔اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہی اُن کی والدہ نے دشمنوں کے خوف سے اللہ کے اشارے پر دریا میں ڈالا اور انہیں بھی اللہ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے فرعون کے محل میں پہنچا دیا۔گویا دونوں کے حالات وواقعات کا اصل ماحصل یہ ہے کہ:

﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢١﴾﴾

یعنی ''اللہ اپنے ارادوں کی تکمیل اور اپنے فیصلوں کی تنفیذ پر پوری طرح قادر ہے 'لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔''

اس میں گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے لیے تسلی اور دل جوئی مضمر ہے کہ اِس وقت سرزمین مکہ میں جن نامساعد حالات کا تمہیں سامنا ہے اور جس قسم کی تکالیف اور مصائب نے تمہیں گھیر رکھا ہے ان سے دل شکستہ نہ ہوں' اللہ قادر ہے اس پر کہ ظاہری مایوسی کی اس سیاہ رات کا پردہ چاک کر کے اُمید کی صبحِ روشن طلوع فرما دے اور تمہارے دشمنوں کی مخالفانہ تدابیر ہی کو تمہارے حق میں خیر و برکت اور کامیابی و کامرانی کا ذریعہ بنا دے۔اس طرح پوری سورۂ یوسف گویا سورۂ ہود کے آخر میں وارد ہونے والی آیت:

﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ (آیت ۱۲۰)

کی تشریح وتفصیل کی حیثیت رکھتی ہے کہ:

''اور (اے نبیؐ!) یہ پیغمبروں کے قصے جو ہم تمہیں سناتے ہیں' یہ وہ تمام چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں۔''

کی تشریح و تفصیل کی حیثیت رکھتی ہے۔

چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ مشرکین مکہ نے تو آنحضور ﷺ کے مکہ سے ہجرت کر کے چلے جانے کو اپنی بڑی کامیابی سمجھا ہوگا' لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی کو آپ ﷺ کے تمکن فی الارض یعنی زمین میں قدم جمانے کا ذریعہ بنا دیا اور کل دس سال بعد آنحضور ﷺ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے اور بعینہٖ وہی صورت پیش آئی جو لگ بھگ ڈھائی ہزار سال قبل پیش آئی تھی کہ جس طرح برادرانِ یوسفؑ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے شرمندگی اور خجالت کا مجسمہ بنے کھڑے تھے' لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے کمالِ مروت سے فرمایا تھا:

﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۹۲﴾

''آج تم پر کوئی گرفت نہیں' اللہ تمہیں معاف کرے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے''۔

اسی طرح جب قریش کے چھوٹے بڑے بھی آنحضور ﷺ کے سامنے ناکامی اور شکست خوردگی کی تصویر بنے کھڑے تھے تو حضور ﷺ نے فرمایا تھا:

((فَاِنِّیْ اَقُوْلُ لَکُمْ مَا قَالَ یُوْسُفُ لِاِخْوَتِہٖ :لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ' اِذْھَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ)) (۱)

''آج میں بھی تم سے وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے کہا تھا' آج تم پر نہ کوئی ملامت ہے نہ سرزنش' جاؤ تم سب آزاد ہو!''

الغرض سورۂ یوسف کا اصل سبق یہی ہے کہ بندۂ مؤمن اور داعیٔ حق کو حالات کی نامساعدت و ناموافقت سے ہرگز ہراساں نہیں ہونا چاہیے' اور اسے اپنے ربّ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا فرض ادا کیے چلے جانا چاہیے۔ رہے نتائج تو انہیں بالکلیہ اللہ کے حوالے کر دینا چاہیے' وہ اپنی حکمت بالغہ اور قدرتِ کاملہ سے جب چاہے گا کامیابی کی صورتیں پیدا

---

(۱) یہ روایت کتب سیرت میں مختلف حوالوں سے نقل ہوئی ہے۔ علامہ البانیؒ نے ڈاکٹر سعید رمضان البوطی کی کتاب فقه السيرة پر اپنے نقد و تبصرے میں اسے ضعیف کہا ہے۔ ملاحظہ ہو: ص۳۸۲۔

فرمادے گا۔ ویسے بھی مؤمن کا اصل مطلوب و مقصود آخرت کی سرخروئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات و واقعات کو ''اَحْسَنُ الْقَصَصِ'' سے تعبیر فرمایا ہے‘ اس لیے مناسب ہے کہ اس موقع پر ان کا ایک خلاصہ بیان کر دیا جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پڑپوتے تھے۔ اُن کا شجرۂ نسب یہ ہے: یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علٰی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو تو حجاز میں بیت اللہ کے جوار میں آباد کر دیا تھا‘ لیکن اپنے دوسرے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام کو موجودہ شرقِ اُردن کے علاقے میں آباد کیا تھا۔ چنانچہ وہیں اُن کے فرزند حضرت یعقوب علیہ السلام آباد تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے دو بیویوں سے بارہ بیٹے تھے‘ جن میں دس بڑی بیوی سے تھے اور دو چھوٹی سے۔ چھوٹی بیوی سے ایک حضرت یوسف علیہ السلام تھے اور دوسرے ان کے حقیقی بھائی بن یامین۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان دونوں سے (غالباً چھوٹے ہونے کی وجہ سے بھی) پیار زیادہ تھا۔ لیکن خصوصاً حضرت یوسف علیہ السلام سے انہیں شدید محبت ان میں رُشد و سعادت اور ہونہاری کے آثار کی بنا پر تھی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس حسن ظن کی توثیق حضرت یوسف علیہ السلام کے ایک خواب سے بھی ہوگئی جس میں انہوں نے دیکھا کہ گیارہ ستارے اور چاند اور سورج ان کے سامنے سربسجود ہیں۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا یہ خواب اپنے والد ماجد کو سنایا تو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ کی جناب میں پسندیدگی و برگزیدگی کی بشارت سنانے کے ساتھ ساتھ اس خواب کو بھائیوں کے سامنے بیان کرنے سے منع کر دیا‘ مبادا وہ حسد کی آگ میں جلنے لگیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کو کوئی گزند پہنچانے کی کوشش کریں۔ لیکن ان کی اس تمام احتیاط کے باوجود حسد کی چنگاری برادرانِ یوسف علیہ السلام کے دلوں میں بھڑک اُٹھی اور انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ اس کانٹے کو راہ سے کیسے ہٹایا جائے۔ بعض کا خیال تھا کہ انہیں قتل کر دیا جائے‘ لیکن سب سے بڑا جو نسبتاً شریف النفس تھا‘ مُصر ہوا کہ اس کے بجائے انہیں کسی کنوئیں میں پھینک دیا جائے۔ اس طرح وہ کسی قافلے کے ہاتھ لگ جائیں گے جو انہیں کسی اور ملک میں لے جائے گا۔ اس طرح بھائی کی

جان بھی نہ جائے گی اور راستے کا کانٹا بھی ہٹ جائے گا۔ چنانچہ اسی کے مطابق انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے اجازت چاہی کہ حضرت یوسفؑ کو اُن کے ساتھ شکار پر بھیج دیں تا کہ وہ بھی کچھ کھیل کود لیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے پہلے تو پس وپیش سے کام لیا اور فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ تم اس کی جانب سے غافل ہو جاؤ اور اسے کوئی بھیڑیا پھاڑ ڈالے۔ لیکن پھر ان کے اصرار پر اجازت دے دی۔ انہوں نے اپنی قرارداد کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کو تو کنوئیں میں پھینک دیا اور ان کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا لائے اور والد کی خدمت میں وہی کہانی گھڑ کر پیش کر دی جس کا اندیشہ خود انہوں نے ظاہر کیا تھا۔ انہوں نے ان کی اس بات کو تو نہ مانا تاہم صبر کی روش اختیار کر لی!

اغلب گمان یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پیدائش ۱۹۰۶ قبل مسیح میں ہوئی اور ۱۸۹۰ قبل مسیح میں جب آنجنابؑ کی عمر کا سترھواں سال تھا' کنوئیں میں پھینکے جانے کا یہ واقعہ پیش آیا جس میں وہ تین دن رات رہے۔ واضح رہے کہ یہی مدت ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غارِ ثور میں بسر کی تھی۔ بہر حال تین دن کے بعد ایک قافلے کا گزر اُدھر سے ہوا اور ان کے سقے نے کنوئیں میں ڈول ڈالا تو حضرت یوسف علیہ السلام نکل آئے۔ قافلے والوں نے انہیں فروختنی مال سمجھ کر چھپا لیا۔ وہ مصر جا رہے تھے' وہاں پہنچتے ہی انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جلدی سے اونے پونے بیچ ڈالا' مبادا ان کا کوئی دعوے دار پہنچ جائے اور انہیں لینے کے دینے پڑ جائیں۔ مصر میں غلاموں کی منڈی سے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدنے والا حکومتِ مصر کا ایک بڑا عہدیدار تھا۔ اس نے انہیں اپنی بیوی کے حوالے کیا اور تاکید بھی کر دی کہ اسے اچھی طرح رکھو' ہوسکتا ہے کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو' بلکہ کیا عجب کہ اسے اپنا متبنیٰ ہی بنا لیں! اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی وقت کی سب سے متمدن مملکت کے ایک بڑے عہدیدار کے گھر میں پرورش کا سامان کر دیا اور خود اُن کے مسندِ اقتدار تک پہنچنے کی راہ ہموار کر دی۔ سورۂ یوسف میں اس مقام پر وارد ہوئے ہیں وہ الفاظ جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے' یعنی:

﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰـكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢١﴾﴾

''اور اللہ اپنے فیصلوں کی تنفیذ پر پوری طرح قادر ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں۔''

حضرت یوسف علیہ السلام جوان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو انہیں علم و حکمت سے نوازا اور نبوت سے سرفراز فرمایا اور دوسری جانب مردانہ حسن و وجاہت کا کامل مرقع بنا دیا اور یہی چیز اُن کے لیے ایک نئی اور زیادہ مشکل آزمائش کا سبب بن گئی۔ عزیز مصر کے یہاں اندازاً چھ سال رہنے کے بعد وہ واقعہ پیش آیا کہ اس کی بیوی نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ کی دعوت دی جس کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے صاف ٹھکرا دیا۔ وہ بدنصیب عورت اس چوٹ سے مزید بپھر گئی اور تریاہٹ کے انداز میں اس پر تل گئی کہ یا تو حضرت یوسف علیہ السلام اس کے پسندیدہ راستے پر چلیں ورنہ وہ انہیں سخت سزا دلوائے گی یا قید خانے میں ڈلوا دے گی۔ اس مرحلے پر حضرت یوسف علیہ السلام نے خود بارگاہِ ربانی میں دعا کی کہ:

''اے ربّ! جس چیز کی یہ لوگ مجھے دعوت دے رہے ہیں اس کی نسبت قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے، اور اگر تو نے ہی ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو کوئی عجب نہیں کہ میں ان کی جانب مائل اور جذبات کی رو میں بہہ جانے والوں میں سے ہو جاؤں۔'' (آیت ۳۳)

اللہ نے ان کی یہ دعا قبول کر لی اور ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام قید خانے میں ڈال دیے گئے۔

قید خانے میں حضرت یوسف علیہ السلام نے دعوت و تبلیغ کا کام شروع کر دیا، اور جب لوگ ان کی شرافت سے متأثر اور خصوصاً ان کی خوابوں کی تعبیر بتانے کی صلاحیت کی بنا پر ان کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ انہیں توحید کی دعوت دیتے کہ:

''اے میرے زنداں کے ساتھیو! (تم خود ہی سوچو) کہ کیا الگ الگ بہت سے ربّ بہتر ہیں یا اکیلا اللہ جو سب پر غالب و قاہر ہے؟ تم لوگ اسے چھوڑ کر جن کو پوجتے ہو اُن کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں، اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری۔ اختیار و اقتدار سب اللہ ہی کا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی

پرستش نہ کرو۔ یہی دین قیم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے!'' (آیات ۳۹،۴۰)

زنداں کے ساتھیوں میں سے ایک کو حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے خواب کی تعبیر کے ضمن میں بتایا کہ وہ جلد رہا ہو جائے گا اور شاہِ مصر کی ساقی گری پر مامور ہوگا۔

تاریخی اعتبار سے یہ جاننا مفید ہے کہ اس وقت مصر پر فراعنہ کا پانچواں خاندان حکمران تھا جنہیں چرواہے بادشاہ یا Hyksos Kings کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اغلباً عربی النسل تھے اور چونکہ خود مصر سے باہر سے آئے ہوئے تھے اس لیے ان کے دلوں میں باہر سے آنے والوں کے لیے ایک نرم گوشہ موجود تھا اور غالباً یہی سبب ہے جس کی بنا پر بعد میں انہوں نے بنی اسرائیل کی حد درجہ پذیرائی کی۔ بہر حال ہوا یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانے میں لگ بھگ سات سال ہو گئے تھے کہ ایک رات شاہِ مصر نے ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر اُس کے درباریوں میں سے کوئی نہ بتا سکا تو اچانک اس کے ساقی کو حضرت یوسف علیہ السلام یاد آئے اور وہ بادشاہ کی اجازت سے قید خانے میں ان کے پاس حاضر ہوا اور اُن سے خواب کی تعبیر دریافت کر کے آیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے نہ صرف یہ کہ خواب کی تعبیر بتائی بلکہ مصر پر جو مصیبت آنے والی تھی اُس سے بچاؤ کی تدبیر بھی بتا دی۔ بادشاہ اس سے بے حد متأثر ہوا اور اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانے سے نکال کر نہ صرف یہ کہ اپنے خاص مصاحبین میں شامل کر لیا' بلکہ حکومتِ مصر میں کسی نہایت اعلیٰ عہدے پر مقرر کر کے پیش آنے والی مصیبت سے نبٹنے کے لیے کلی اختیارات اُن کے حوالے کر دیے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام اُس عہدے پر فائز ہوئے اس وقت ان کی عمر تیس برس تھی اور پورے اسّی سال وہ اس منصب پر فائز رہے۔

جس مصیبت کی خبر حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے خواب کی تعبیر کے ضمن میں دی تھی وہ ایک خوفناک قحط تھا جس نے نہ صرف مصر بلکہ اطراف و جوانب کے ملکوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کے لیے غلے کا جو ذخیرہ کر لیا تھا اُس سے دور دور تک کے لوگوں کی جان بچانے کی صورت پیدا ہو گئی اور یہی تقریب ہوئی برادرانِ یوسفؑ کے مصر حاضر ہونے کی۔ وہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش ہوئے تو آنجنابؑ نے تو انہیں

پہچان لیا، لیکن اُن کے سان گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ جس بھائی کو انہوں نے پندرہ بیس سال قبل کنوئیں میں پھینکا تھا وہی آج عزیزِ مصر کی صورت میں اُن کے سامنے موجود ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان پر رحم کھایا اور انہیں غلہ وغیرہ دیا، لیکن اپنے آپ کو اُن پر ظاہر نہ کیا، بلکہ اصرار کر کے اپنے بھائی بن یامین کو بھی مصر بلا لیا اور ایک ایسی تدبیر سے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے پیدا کی، اُسے اپنے پاس روک لیا۔ یہ صورت حال جاری رہی تا آنکہ وہ وقت بھی آیا جب برادرانِ یوسف علیہ السلام کے پاس غلہ خریدنے کے لیے پھوٹی کوڑی تک نہ رہی اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام سے غلے کی بھیگ مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ بھائیوں کا یہ حال حضرت یوسف علیہ السلام سے نہ دیکھا گیا اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو اُن پر ظاہر کر دیا بلکہ حکم دیا کہ والد ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام سمیت پورے خاندان کو لے کر مصر آ جاؤ اور یہیں سکونت اختیار کر لو! اور اس طرح اسرائیل و بنی اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے تمام بیٹے اپنے اہل وعیال سمیت مصر منتقل ہو گئے۔ جہاں بادشاہِ وقت نے اُن کی خوب پذیرائی کی۔ مصر کے زرخیز ترین علاقے میں اُنہیں آباد کیا۔ اور چونکہ بادشاہ حضرت یوسف علیہ السلام کا عقیدت مند تھا، لہٰذا انہیں مصر میں گویا پیرزادوں کی سی عزت وحیثیت حاصل ہو گئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک عرصے کے بعد جب مصر میں ایک قومی انقلاب آیا اور Hyksos Kings کا خاتمہ ہو گیا تو بنی اسرائیل پر بھی مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جس سے ایک مدت کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے نجات دی۔

سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ابتلاء کے ساتھ ساتھ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء اور صبر کا ذکر بھی نہایت سبق آموز طریق پر آیا ہے۔ انہیں حضرت یوسف علیہ السلام سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ اور انہیں اللہ کی طرف سے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بقیدِ حیات ہیں۔ چنانچہ ہجر وفراق کا غم انہیں اندر ہی اندر کھاتا رہا یہاں تک کہ جوشِ گریہ سے ان کی بینائی جاتی رہی، تاہم زبان سے ہر موقع پر ایک ہی جملہ ادا ہوا، یعنی:

﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ۝۱۸﴾

''پس اب صبر ہی بہتر ہے۔ اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں اس بات پر جو تم ظاہر کرتے ہو۔''

اور:

﴿فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا﴾ (آیت ۸۳)

''پس اب صبر ہی بہتر ہے۔ شاید اللہ لے آئے میرے پاس اُن کو''۔

یعنی ہر حال میں صبر ہی اہل ایمان کے لیے صحیح لائحہ عمل ہے' اور جب گھر والوں نے حد سے زیادہ رنج وغم پر اُنہیں ٹوکا تو انہوں نے فرمایا:

﴿اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ (آیت ۸۶)

''میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ اپنے اللہ ہی سے کرتا ہوں!''

چنانچہ یہی صورت ہمیں سیرت نبی اُمی ﷺ میں نظر آتی ہے کہ جب آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا اور آپؐ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں اور بعض لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو آپؐ نے فرمایا:

''دل یقیناً غم زدہ ہے اور آنکھیں بھی اشکبار ہیں' لیکن ہماری زبان پر اس کے سوا کچھ نہیں آئے گا کہ جس چیز میں اللہ راضی ہے ہم بھی اُسی پر راضی ہیں۔''

اور جب طائف میں آنحضور ﷺ پر پتھروں کی بارش ہوئی اور آپ ﷺ کا جسم مبارک لہولہان ہو گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ استہزاء اور تمسخر کی حد ہو گئی تو وہاں سے واپسی پر جو دلوں کو دہلا دینے والی دُعا آپؐ نے مانگی' اُس کا آغاز اِن الفاظ سے ہوا کہ:

((اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ))

''اے اللہ! تیری ہی جناب میں شکوہ کرتا ہوں اپنی قوت کی کمی اور وسائل کے فقدان اور لوگوں کے سامنے رسوائی کا''

الغرض سورۂ یوسف میں جہاں حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت کی صورت میں ایک صابر وشاکر اور باہمت و باعفت نوجوان اور ایک اولوالعزم داعیٔ حق اور مبلغ توحید اور ایک صالح اور مدبر و منتظم حکمران کا کردار سامنے آتا ہے وہاں حضرت یعقوب علیہ السلام کی شخصیت کی

صورت میں ایک حد درجہ رقیق القلب اور صاحب قلب محزون درویش کا کردار بھی سامنے آتا ہے جو اپنے غم واندوہ کو اندر ہی اندر پیتا ہے اور اگر کوئی شکایت کرتا بھی ہے تو صرف اپنے خالق و مالک کی بارگاہ میں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مبارکہ میں یہ سب اوصاف بیک وقت جمع تھے۔ بالکل صحیح کہا جس نے کہا:

حسن یوسفؑ ، دَمِ عیسٰیؑ یدِ بیضاداری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

سورۂ یوسف کے آغاز و اختتام پر بھی قرآن کے ایک کتابِ مبین اور منزل من اللہ ہونے کا بیان ہے، بلکہ آخری آیت میں تو خود قصۂ یوسف کو جو سورۂ یوسف میں بیان ہوا' قرآن کے وحیٔ الٰہی ہونے کی دلیل کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ اس لیے کہ ڈھائی ہزار سال قبل کے حالات و واقعات اس قدر صحت و وضاحت کے ساتھ عرب کا ایک اُمی (ﷺ) کیسے بیان کرسکتا تھا:

﴿مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ تَفْصِيْلَ كُلِّ شَىْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّـؤْمِنُوْنَ﴿١١١﴾﴾

''یہ کوئی گھڑی ہوئی بات نہیں' بلکہ تصدیق ہے اس کی جو پہلے سے موجود ہے اور تفصیل ہے ہر چیز کی' اور ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔''

''مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى '' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں کہ اس سورۂ مبارکہ کا ایک ربط و تعلق ہے سورۂ یونس اور سورۂ ہود دونوں سے' اس لیے کہ ان دونوں سورتوں میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: اَمْ يَـقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ ۔ گویا ان تینوں سورتوں میں اصل نسبتِ زوجیت تو ہے سورۂ یونس اور سورۂ ہود کے مابین اور سورۂ یوسف ان دونوں کے ساتھ بطورِ ضمیمہ منسلک ہے۔ چنانچہ توحید' معاد' رسالت اور رسولوں کی قوموں پر ان کی دعوت سے اعراض وانکار کی پاداش میں عذابِ الٰہی کے ان مضامین کا ایک خلاصہ بھی اس سورۂ مبارکہ کے آخر میں درج کر دیا گیا ہے جو نہایت شرح وبسط کے ساتھ سورۂ یونس اور سورۂ ہود میں بیان ہوئے اور اس ضمن میں دو آیتیں نہایت اہم وارد ہوئی ہیں۔ ایک وہ جس میں شرک کی ہمہ گیری کا نقشہ

کھینچا گیا ہے کہ اکثر لوگ اللہ کو نہیں مانتے مگر کسی نہ کسی نوع کے شرک کے ساتھ' اور دوسری میں آنحضور ﷺ سے کہلوایا گیا کہ:

''کہہ دو' یہ میری راہ ہے' میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں پوری بصیرت کے ساتھ' میں بھی اور وہ بھی جس نے میری پیروی کی۔ اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔'' (آیت ۱۰۸)

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

تقریر نمبر ۱۳

سورۃ الرعد' سورۂ ابراھیم' سورۃ الحجر

سورۃ الرعد اور سورۂ ابراہیم علی الترتیب چھ رکوعوں اور ۴۳ آیات اور سات رکوعوں اور ۵۲ آیات پر مشتمل ہیں اور انداز و اسلوب اور مضمون و موضوع ہر اعتبار سے مکی دور کے اواخر میں نازل ہونے والی سورتوں کے مشابہ ہیں' جبکہ سورۃ الحجر کے چھ رکوع ۹۹ آیات پر مشتمل ہیں۔ گویا اس میں آیات نسبتاً چھوٹی ہیں' مزید برآں اس کا اسٹائل بھی مکی دور کے اوائل میں نازل ہونے والی سورتوں سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے اور اس کے مضامین بھی خصوصاً آغاز واختتام پر وہی ہیں جو ابتدائی مکی سورتوں میں پائے جاتے ہیں۔

سورۃ الرعد

سورۃ الرعد میں قصص الانبیاء یا انباء الرسل کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے اور پوری سورۃ جو ایک مسلسل اور مربوط خطبہ نظر آتی ہے' توحید' معاد اور رسالت کے اساسی مباحث پر مشتمل ہے۔ اور ان میں سے بھی زیادہ زور ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت پر ہے۔ اگرچہ آفاق وانفس کے جن شواہد سے قیامِ قیامت اور بعث بعد الموت پر استدلال کیا گیا ہے' ان سے ضمنی طور پر توحید کا اثبات بھی ہوتا چلا جاتا ہے۔

پہلی آیت میں قرآن مجید کی حقانیت کا بیان ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

''ا۔ل۔م۔ر۔ یہ کتابِ الٰہی کی آیات ہیں۔اور (اے نبیؐ!) جو کچھ آپ کے ربّ کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ سرتا سر حق ہے' لیکن اکثر لوگ ماننے والے نہیں ہیں۔''

اس کے بعد تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے شواہد کی جانب توجہ دلا کر آیت ۵ میں بڑے دلنشین پیرائے میں فرمایا:

''اور اگر تعجب کرنا ہی چاہو تو قابل تعجب ہے ان منکرین قیامت کا یہ قول کہ کیا جب ہم مٹی ہو کر مٹی میں مل جائیں گے تو پھر از سرِ نو زندہ کر دیے جائیں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ربّ کا کفر کیا ہے اور اُن کی گردنوں میں طوق ہیں اور یہ جہنمی ہیں جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے!''

حاصل کلام یہ کہ جو شخص اللہ ہی کو نہ مانے یا اُس کی قدرتِ مطلقہ پر یقین نہ رکھتا ہو اُس کی بات دوسری ہے۔ لیکن جو اللہ کو بھی مانتا ہو اور اس کے ''عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر'' ہونے پر بھی یقین رکھتا ہو' پھر بھی بعث بعد الموت کے بارے میں استعجاب یا استبعاد کا اظہار کرے تو اس کی حالت واقعتاً قابل تعجب ہے۔ اور جو کوئی یہ کرتا ہے وہ گویا اپنے ربّ اور اُس کی صفاتِ کاملہ کا انکار کرتا ہے۔

اس کے بعد پھر اللہ کی قدرتِ کاملہ اور علم کامل کا بیان ہے اور پھر آیت ۱۱ میں عمرانیاتِ انسانی کا وہ زرین اور اٹل اُصول بیان ہوا ہے کہ:

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ﴾

جس کا سرسری مفہوم تو وہ ہے جو اس مشہور شعر میں بیان ہوا کہ ؎

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

لیکن اصل مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کے خارج کے احوال ان کے باطن کی کیفیات کے تابع ہیں اور اگر کسی قوم کے لوگ اپنی شخصیتوں کی اندرونی دنیا میں انقلاب برپا کرنے کو تیار نہ ہوں تو ان کے خارجی حالات میں بھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ واضح رہے کہ علامہ

اقبال مرحوم نے قرآن حکیم کی تاثیر کا یہی نقشہ کھینچا ہے کہ یہ انسانوں کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے جس سے ان کے اندر کی دنیا میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور یہی باطنی انقلاب ہے جو تمہید بنتا ہے خارجی وظاہری حتیٰ کہ عالمی انقلاب کی:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد' جہاں دیگر شود!

عمرانیاتِ انسانیہ کا ایک دوسرا اہم اُصول آیت ۱۷ میں بیان ہوا ہے کہ جس طرح تم دیکھتے ہو کہ جب بارش ہوتی ہے اور پہاڑی علاقوں میں وادیاں ندیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں تو پانی کے اُوپر بہت سا جھاڑ جھنکاڑ اور جھاگ نظر آتا ہے۔ حالانکہ اس کی حقیقت کوئی نہیں ہوتی' اصلاً مفید تو وہ پانی ہے جو اُس کے نیچے بہہ رہا ہے' خواہ وہ نظر نہ آ رہا ہو۔ اسی طرح جب سنار سونے یا چاندی کو صاف کرنے کے لیے کُٹھالی میں تپاتا ہے تو اس میں بھی بہت سا جھاگ اُٹھتا ہے جس میں سوائے میل کے کچھ نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح اس عالم انسانی میں بھی حق و باطل کے مابین ایک مسلسل تصادم اور ٹکراؤ جاری رہتا ہے۔ جس سے کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ گویا باطل غالب آ گیا اور چہار طرف اس کا ڈنکا بجنے لگا' لیکن حقیقت میں یہ بھی بس جھاگ ہی کے مانند ہوتا ہے۔ اس لیے کہ زمین میں قرار وہی چیز پکڑتی ہے جو واقعتاً مفید و نافع ہو اور یہ معاملہ ظاہر ہے کہ صرف حق کا ہوتا ہے لہٰذا بالآخر حق ہی کا بول بالا ہوتا ہے اور باطل نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے۔

سورۃ الرعد کا تیسرا رکوع سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع سے بڑی گہری مشابہت رکھتا ہے اور یہ الفاظ تو جوں کے توں بغیر کسی ایک شوشے کے فرق کے آئے ہیں کہ:

﴿وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ (آیت ۲۵)

''اور وہ لوگ جو توڑتے ہیں اللہ کے عہد کو اس کو مضبوطی سے باندھنے کے بعد' اور کاٹتے ہیں اُسے جسے اللہ نے حکم دیا ہے جوڑنے کا اور فساد مچاتے ہیں زمین میں۔''

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ میں بھی انسانی اجتماعیات کا یہ اہم اُصول

بیان ہوا ہے کہ معاملاتِ انسانی کے سارے بگاڑ کی جڑ اور بنیاد دو چیزیں ہیں' ایک اللہ کے ساتھ جو عہد الست انسان نے کیا تھا اس کو نظر انداز کر کے اپنی من مانی کرنے پر اُتر آنا اور دوسرے رحمی رشتوں کو جوڑنے کے بجائے کاٹنے پر آمادہ ہو جانا! پہلی چیز سے اللہ کے ساتھ تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور دوسری سے حقوق العباد کا پورا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کے ساتھ اس اہم مشابہت سے یہ بھی رہنمائی ملتی ہے کہ یہ سورت ہجرت سے متصلاً قبل ہی کے زمانے میں نازل ہوئی ہوگی!

سورت کے آخر میں زیادہ زور نبوت و رسالت کے موضوع پر ہے۔ چنانچہ آخری آیت میں فرمایا گیا:

''اور یہ کافر کہتے ہیں تم ہرگز رسول نہیں ہو' کہہ دو کہ میرے اور تمہارے مابین اصل گواہ تو اللہ ہی ہے۔ البتہ جن کے پاس کتاب کا کچھ علم ہے (یعنی یہود و نصاریٰ) وہ بھی جانتے ہیں (کہ میں رسول ہوں!)''

اور اس سے پہلے بظاہر آنحضور ﷺ کو خطاب فرمایا گیا ہے' اگرچہ رُوئے سخن تمام تر کفار کی جانب ہے گویا اُن سے کہا جا رہا ہو کہ...... رہا تمہارا یہ اعتراض کہ یہ تو عام انسانوں کے مانند ہیں اور اُن کی بیوی بھی ہے اور اولاد بھی' تو اگر تم نہیں جانتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو کہ ہم نے پہلے بھی جتنے رسول بھیجے وہ سب انسان ہی تھے اور اہل و عیال والے تھے۔ رہا تمہارا یہ مطالبہ کہ وہ کوئی حسی معجزہ کیوں نہیں دکھاتے تو یہ معاملہ ان کے اختیار میں ہے ہی نہیں' اس کا سارا دارومدار ہم پر ہے۔ باقی اگر تمہاری آنکھوں پر پردے نہیں پڑ گئے ہیں تو دیکھ لو کہ ہمارے نبیؐ کی دعوت اطراف واکنافِ عرب میں پھیل رہی ہے۔ گویا یہ دعوت تمہارے چاروں طرف سے گھیرا تنگ کرتی ہوئی بڑھی چلی آ رہی ہے۔ اگر اب بھی آنکھیں نہ کھولو گے تو بہرحال اللہ کا فیصلہ تو اٹل ہے' حق کا تو بول بالا ہو کر ہی رہے گا۔ البتہ تم اپنی محرومی و بدبختی پر اللہ کی جانب سے آخری مہرِ تصدیق ثبت کرا لو گے۔

سورۂ ابراھیم

سورۂ ابراہیم کا آغاز بھی قرآن مجید ہی کے ذکر سے ہوا کہ:

''ا۔ل۔ر۔ یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے (اے نبیؐ!) آپ پر اس لیے نازل کی کہ آپؐ لوگوں کو اندھیروں سے روشنی میں لائیں!''

اس کے بعد رسولوں اور ان کی قوموں کا ذکر ہوا' حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قدرے تفصیل سے اور حضراتِ نوح' ہود اور صالح علیہم السلام کا اجمالاً۔ اور اس میں نقشہ کھینچ دیا گیا کہ ان سب کی دعوت بھی وہی تھی جو آج نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرما رہے ہیں اور ان کی قوموں نے بھی اُسی طرح کے بے بنیاد اعتراضات کیے تھے جیسے آج قریش مکہ خصوصاً اُن کے سردار کر رہے ہیں' اور انہوں نے بھی اسی طرح اپنے رسولوں کو اپنی بستیوں سے نکال باہر کرنے کی دھمکی دی تھی جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثاروں پر مکہ کی سرزمین تنگ کر دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں آخری بات جو از خود ظاہر تھی' بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی کہ جس طرح اُن پر اللہ کے عذاب آئے اسی طرح تم بھی عذابِ الٰہی کے لیے تیار رہو...... پھر گویا قریش کے عوام کو خطاب کر کے فرمایا گیا: آج تو تم اپنے سرداروں کے کہنے میں آ کر ہمارے نبی کی تکذیب کر رہے ہو اور ان کو ستانے سے بھی باز نہیں آتے' لیکن قیامت کے دن نہ تمہارے یہ سردار تمہیں اللہ کے عذاب سے بچا سکیں گے اور نہ وہ شیطانِ لعین تمہارا ساتھ دے گا جو تمہارا اور تمہارے سرداروں اور پیشواؤں سب کا گُرو ہے۔ چنانچہ آیات ۲۱' ۲۲ میں نقشہ کھینچ دیا گیا:

''اور پھر سب کے سب پیش ہوں گے اللہ کے سامنے' تو کمزور (اور پس ماندہ) لوگ کہیں گے بڑائی والوں سے (اپنے سرداروں اور چوہدریوں) سے: ہم تو تمہاری ہی پیروی کرتے رہے تو کیا اب تم لوگ ہمیں کسی قدر اللہ کے عذاب سے بچا سکتے ہو (کچھ کمی بھی کرا سکتے ہو یا نہیں؟) تو وہ کہیں گے کہ اگر اللہ نے ہمیں ہدایت دی ہوتی تو ہم بھی تم کو سیدھی راہ دکھا دیتے' اب ہمارے لیے برابر ہے ہم صبر کریں یا فریاد (بہر حال) بچنے کی کوئی صورت ممکن نہیں!'' اور جب سارا معاملہ چُک جائے گا تو شیطان کہے گا: یقیناً اللہ نے بھی تم سے ایک وعدہ کیا تھا جو سراسر حق تھا (اور اُس نے اُسے پورا کر دیا ہے) اور میں نے بھی (کچھ) وعدے تم سے کیے تھے جو میں

نے تم سے پورے نہیں کیے' لیکن مجھے تم پر کوئی زور حاصل نہیں تھا' سوائے اس کے کہ میں نے تم کو دعوت دی تو تم نے میری دعوت قبول کر لی' تو اب تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ نہ میں تمھاری فریاد رسی کر سکتا ہوں نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو!''

اپنے نام کی مناسبت سے اس سورۂ مبارکہ کا ایک پورا رکوع حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر پر مشتمل ہے اور انداز اس قدر دلنشیں ہے کہ آنجنابؑ کی ایک دعا میں شرک سے بیزاری اور توحید کا اقرار و اعلان بھی آ گیا۔ خانہ کعبہ کی تعمیر اور اس کے جوار میں اپنی نسل کی ایک شاخ کو آباد کرنے کا مقصد بھی بیان ہو گیا۔ بڑھاپے میں حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق علیہما السلام ایسے بیٹے عطا ہونے پر ہدیۂ تشکر و اِمتنان بھی آ گیا' اور ذریت اسمعیل کے لیے دُعائے خیر بھی آ گئی اور اپنے اور اپنے والدین اور کل اہل ایمان کے لیے دُعائے مغفرت بھی آ گئی۔

سورت کے آخر میں کفار و مشرکین' بالخصوص قریش مکہ اور ان کے سرداروں کو متنبہ کر دیا گیا کہ ہرگز یہ گمان نہ کرنا کہ اللہ اپنے رسولوں سے کیے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزی کرے گا۔ وہ زبردست بھی ہے اور انتقام لینے والا بھی۔ اور یہ تنبیہہ ہے لوگوں کے لیے تا کہ خبردار ہو جائیں اور جان لیں کہ اللہ ہی اکیلا الٰہ ہے' اور ہوش مند لوگ یاد دہانی حاصل کر لیں۔ ہمارے سابق انبیاء و رُسلؑ کی قوموں نے بھی ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیا تھا اور بڑی ڈھٹائی اور جسارت کے ساتھ ہم سے فیصلہ صادر کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ چنانچہ ہم نے ان کو ہلاک و برباد کر دیا۔ تو اپنے بارے میں اب تم خود سوچ لو۔

سورۃ الحِجر

سورۃ الحجر کا آغاز بھی قرآن حکیم ہی کے ذکر سے ہوا کہ:

''ا۔ل۔ر۔ یہ کتابِ الٰہی اور قرآن مبین کی آیات ہیں!''

اور اُس کے فوراً بعد بڑے تیکھے انداز میں فرمایا گیا کہ اِس وقت تو یہ کفار و معاندین طرح

طرح کی باتیں بنا رہے ہیں اور ہمارے نبیؐ پر فقرے کس رہے ہیں، حتیٰ کہ انہیں مجنون اور دیوانہ کہنے سے بھی گریز نہیں کر رہے، لیکن ایک وقت آئے گا کہ یہ کفِ افسوس مل کر کہیں گے:

''کاش ہم سرِتسلیم خم کر دیتے (ایمان لے آتے اور اطاعت قبول کر لیتے)

''تو (اے نبیؐ!) آپ انہیں ذرا چھوڑیے (اُن کی پرواہ نہ کیجیے) یہ ذرا کھا پی لیں اور مزے کر لیں اور بھلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی اُمید۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا''۔

اس کے بعد آنحضور ﷺ کی دلجوئی کے لیے فرمایا گیا:

''اور ہم نے آپؐ سے پہلے بھی بہت سی قوموں میں اپنے رسول بھیجے۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اُن کے پاس کوئی رسول آیا ہو اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔ (آپ کی طرح اُن سب کا مذاق اڑایا گیا) مجرموں کے دلوں میں تو ہم اس ذکر کو اسی طرح (سلاخ کے مانند) گزارتے ہیں۔ وہ اس پر ایمان نہیں لایا کرتے۔ قدیم سے اس قماش کے لوگوں کا یہی طریقہ چلا آ رہا ہے (یعنی اب یہ لوگ بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ رہا ان کا یہ مطالبہ کہ ہمیں کوئی صریح اور محسوس معجزہ دکھا دو تو ہم مان لیں گے تو آپ یقین رکھیں کہ) اگر ہم اُن کے لیے آسمان میں ایک دروازہ کھول دیں اور یہ اس میں دن دیہاڑے چڑھنے لگیں تو بھی یہ یہی کہیں گے کہ ہماری نظر بندی کر دی گئی اور ہم پر جادو کر دیا گیا تھا!'' (آیات ۱۰ تا ۱۵)

سورۃ الحجر کا تیسرا رکوع بہت اہمیت کا حامل ہے' اس لیے کہ اس میں قصۂ آدم و ابلیس ایک نئے انداز میں بیان ہوا۔ اس سے قبل یہ قصہ سورۃ البقرۃ کے چوتھے اور سورۃ الاعراف کے دوسرے رکوع میں بیان ہو چکا ہے۔ اس مقام پر ایک تو حضرت آدم علیہ السلام کے مادۂ تخلیق کے بارے میں: ﴿مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝٢٦﴾ (سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے) ایسے بھاری الفاظ جوں کے توں پورے تین بار آئے جس سے اشارہ ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا مادۂ تخلیق ایسا سنا اور سڑا ہوا گارا تھا جو سوکھ کر کھنکھنانے لگا تھا' جس کی تائید ہوتی ہے جدید سائنسی انکشاف سے کہ حیات کا آغاز ان دلدلی علاقوں میں ہوا جہاں مٹی اور پانی

کے مسلسل تعامل سے خمیر سا اُٹھ آتا ہے اور گارے میں بد بو پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم ملائکہ کو تخلیق آدم سے بہت قبل دے دیا گیا تھا۔ تیسرے یہ کہ آدم علیہ السلام کی فضیلت کی اصل بنیاد وہ رُوحِ ربانی ہے جو اُن کے جسد خاکی میں پھونکی گئی اور جسے اللہ نے واحد متکلم کی ضمیر کے حوالے سے خاص اپنی ذات کی جانب منسوب کیا ہے، بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِينَ ۝٢٩﴾

''پس جب میں اس کی تخلیق مکمل کرلوں (اس کی نوک پلک سنوار دوں) اور اس میں پھونک دُوں اپنی رُوح میں سے تو گر پڑنا اُس کے سامنے سجدے میں!''

ان حقائق و معارفِ علمیہ کے ساتھ ساتھ واضح کر دی گئی وہ حقیقت جو قرآن میں اس قصے کے بتکرار و اعادہ ذکر کے اصل مقصد کی حیثیت رکھتی ہے کہ آدم کی اِسی فضیلت پر شیطان حسد کی آگ میں جل اُٹھا اور اُس کے دل میں آدم اور ذریت آدم کی عداوت اور دشمنی نے جڑ پکڑ لی۔ چنانچہ اللہ سے مہلت مل جانے پر اب وہ تا قیامت نسل انسانی کی گمراہی کے درپے ہے اور اُسے تباہ و برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس ضمن میں وہ حقیقت بھی بیان کر دی گئی جو اس سے قبل سورۂ ابراہیم علیہ السلام میں میدانِ حشر کے مکالمے کی صورت میں بیان ہو چکی ہے۔ یعنی یہ کہ شیطان کو اللہ کے بندوں پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ وہ گناہ کی دعوت ضرور دیتا ہے لیکن اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا سراسر انسان کے اپنے اختیار میں ہے، بفحوائے الفاظ قرآنی:

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِينَ ۝٤٢﴾

''بے شک میرے بندوں پر تجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا سوائے ان نابکاروں کے جو خود ہی تیری پیروی اختیار کرلیں۔''

اس کے بعد مکی سورتوں کے عام اسلوب کے مطابق انبیاء و رُسل علیہم السلام کا ذکر ہے، اور یہاں تفصیل کے ساتھ ذکر آیا ہے حضرت لوط علیہ السلام اور اُن کی قوم کا۔ اور اسی کے ذیل میں ضمناً

ذکر آیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کہ وہی فرشتے جو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب کا فرمان لے کر نازل ہوئے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی خوشخبری بھی دینے گئے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے انجام کے ذکر کے بعد اجمالاً اشارہ کیا گیا قومِ شعیبؑ اور قومِ صالحؑ کے انجام کی طرف، اس صراحت کے ساتھ کہ ان تینوں اقوام کی تباہ شدہ بستیاں اور اُن کے مساکن کے کھنڈرات ''سبیلِ مقیم''، یعنی اس تجارتی شاہراہ پر واقع ہیں جس پر اہل عرب کے تجارتی قافلے دن رات چلتے رہتے تھے۔ یعنی شمال سے جنوب کی جانب پہلے قومِ لوطؑ کی تباہ شدہ بستیاں، پھر قومِ شعیب کے تباہ شدہ مسکن اور قومِ ثمود کے کھنڈرات۔

مکی دَور کے اوائل میں نازل ہونے والی اکثر سورتوں کی طرح سورۃ الحجر کے آخر میں بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مفصل خطاب بھی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب خصوصی عنایت اور التفات بھی۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ:

> ''اور (اے نبیؐ!) ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے مابین ہے، حق کے ساتھ بنائے ہیں۔ اور قیامت بہر حال آ کر رہے گی جبکہ ہر ایک کو اپنے کیے کا پورا بدلہ مل جائے گا۔ تو آپؐ ذرا ان کافروں سے درگزر فرمائیں اور اُن کے تمسخر و استہزاء کو نظر انداز کر دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب جہاں سب کا خالق ہے وہاں سب کے حال سے باخبر بھی ہے! اور ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سات بار بار دہرائی جانے والی آیات یعنی سورۃ الفاتحہ ایسی نعمت عظیمہ اور قرآن عظیم ایسی دولت بے بہا عطا فرمائی ہے۔ تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کی جانب نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں جنہیں ہم نے اس دُنیا کی حقیر سی پونجی وافر مقدار میں عطا کر دی ہے اور نہ ہی اُن کے بارے میں رنج و اندوہ آپؐ کے قلب پر طاری ہونے پائے۔ آپ کی عنایت و شفقت شامل حال رہنی چاہیے اہل ایمان کے! اور صاف کہہ دیجیے کہ میں تو کھلا خبردار کر دینے والا ہوں۔ جیسا کہ ہم نے وعید نازل کی ہے اُن کے لیے جو قرآن کا استہزاء کرتے ہیں، تو تیرے ربّ کی قسم! ہم ان سب سے پوچھ لیں گے کہ وہ کیا کرتے رہے تھے! اور آپ ڈنکے کی چوٹ اعلان کر دیجیے جس کا حکم آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)

کو ہوا اور مشرکوں کی پرواہ مت کیجئے' اُن کے تمسخر و استہزاء سے ہم نبٹ لیں گے۔ وہ لوگ جو اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ٹھہرا رہے ہیں انہیں عنقریب حقیقت معلوم ہو جائے گی' اور ہمیں خوب معلوم ہے کہ ان لوگوں کی باتوں سے آپ (ﷺ) کو صدمہ ہوتا ہے۔ پس آپؐ اپنے ربّ کی تسبیح و تحمید میں لگے رہیے اور اس کے سامنے سربسجود ہونے والوں میں شامل رہیے۔ اور تادمِ آخر اس کی پرستش پر کاربند رہیے!'' (آیات ۸۵تا۹۹)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ!

۞۞۞

تقریر نمبر ۱۴

قرآن حکیم میں سورۂ یونس سے مکی سورتوں کا جو عظیم سلسلہ شروع ہوتا ہے اس میں پہلے تین سورتیں قدرے طویل ہیں یعنی سورۂ یونس' سورۂ ہود اور سورۂ یوسف جو علی الترتیب ۱۱، ۱۰، اور ۱۲ رکوعوں پر مشتمل ہیں۔ پھر تین سورتیں قدرے چھوٹی آتی ہیں' یعنی سورۂ رعد ' سورۂ ابراہیم اور سورۂ حجر جو علی الترتیب ۶' ۷ اور ۶ رکوعوں پر مشتمل ہیں اور پھر ایک گروپ تین طویل سورتوں کا ہے یعنی سورۂ نحل' سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ کہف جو علی الترتیب ۱۶ رکوعوں اور ۱۲۸ آیات اور ۱۲ رکوعوں اور ۱۱۱ آیات اور ۱۲ رکوعوں اور ۱۱۰ آیات پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ کہف حکمت قرآنی کے عظیم ترین خزانے کی حیثیت رکھتی ہیں' اور ان میں مضامین کی بڑی گہری مناسبت اور مشابہت پائی جاتی ہے جب کہ سورۂ نحل منفرد مزاج کی حامل ہے' اگرچہ سورۂ بنی اسرائیل کے ساتھ اس کے مضامین کا بہت گہرا ربط موجود ہے۔ گویا تین مکی سورتوں کے اس چھوٹے گروپ میں قرآنی سورتوں کے مابین نسبت زوجیت کا مظہرِ اتم تو ہیں سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف البتہ سورۃ النحل بھی ان دونوں کے ساتھ غایت درجہ مربوط و متعلق ہے۔ اس ابتدائی تعارف کے بعد آیئے کہ سورۂ نحل کے مضامین پر قدرے تفصیلی نگاہ ڈالیں۔

سورۃ النحل

سابقہ سورتوں کے برعکس سورۃ النحل کے آغاز میں نہ حروفِ مقطعات ہیں نہ قرآن مجید کی عظمت کا کوئی تمہیدی بیان' بلکہ بات براہِ راست تنبیہہ سے شروع ہوگئی کہ:

''اللہ کا فیصلہ (سر پر) آیا کھڑا ہے تو اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ' وہ پاک اور بلند و برتر ہے اس شرک سے جو وہ کر رہے ہیں!''

بعینہٖ یہی رنگ اس سورۂ مبارکہ کے اختتام پر بھی ہے' صرف اس فرق کے ساتھ کہ آغاز میں کفار ومشرکین کے لیے انذار کا رنگ ہے اور اختتام پر آنحضورﷺ اور اہل ایمان کے لیے تبشیر کا۔ یعنی:

''پس (اے نبیؐ!) صبر کرو اور ظاہر ہے کہ تمہارا صبر اللہ ہی کے بھروسے پر قائم ہے' اور تمہیں نہ تو ان (کفار ومشرکین) کے انجام پر غمگین ہونے کی ضرورت ہے نہ ان کی (مخالفانہ) چالوں اور تدبیروں سے پریشان ہونے کی' یقیناً اللہ ساتھ ہے (یعنی اس کی تائید ونصرت شامل حال ہے) ان کے جنہوں نے تقویٰ اور احسان کی روش اختیار کی!''

قرآن حکیم میں ''تذکیر بآلآء اللّٰہ'' یعنی اللہ کی نعمتوں کے حوالے سے اس پر ایمان لانے' اُس کی توحید پر کاربند رہنے اور اس کی جزا وسزا پر یقین رکھنے اور اس کے احکام پر کاربند رہنے کی دعوت کی سب سے زیادہ شاندار مثال غالباً سورۃ النحل ہی ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا تانا بانا اللہ تعالیٰ کی ارضی وسماوی' آفاقی و انفسی' ظاہری و باطنی اور محسوس ومعقول نعمتوں کے ذکر سے تیار ہوا ہے اور ان ہی میں جابجا سجا دیے گئے ہیں توحید' معاد اور رسالت کے اساسی مضامین اور ان دونوں کے باہمی ربط وتعلق کے جانب اشارہ کیا گیا ہے ایسے الفاظ سے کہ:

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ⑪﴾

''بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر سے کام لیں۔''

اور:

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾

’’یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں‘‘۔

اور:

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّکَّرُوْنَ﴾

’’بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو یاددہانی حاصل کریں۔‘‘

اور:

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ﴾

’’یقیناً اس میں نشانی ہے اُن کے لیے جو سنتے ہیں۔‘‘

اور:

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ﴾

’’بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو ماننے پر آمادہ ہوں۔‘‘

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر جس جامعیت کے ساتھ اس سورۂ مبارکہ میں ملتا ہے اس کی شاید ہی کوئی دوسری نظیر قرآن مجید میں موجود ہو۔ اس مضمون کا آغاز آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے ذکر سے ہوا کہ اللہ نے اس کائنات کو حق کے ساتھ تخلیق فرمایا۔ پھر ذکر ہوا انسان کی تخلیق کا کہ اسے پیدا کیا اُس نے نطفے سے تو کیسی عجیب بات ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک ہی کے بارے میں جھگڑتا ہے۔ پھر ذکر آیا چوپایوں کی تخلیق کا کہ پیدا کیے اُس نے لاتعداد چوپائے جن سے تم غذا بھی حاصل کرتے ہو، ان کو اپنی سواری کے طور پر بھی استعمال کرتے ہو اور باربرداری کے کام میں بھی لاتے ہو۔ پھر ان میں تمہارے لیے حسن و جمال اور زیبائش و آرائش کا سامان بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کے گوبر اور خون کے درمیان سے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے دودھ ایسا پاکیزہ اور اعلیٰ مشروب فراہم کرتا ہے، اور تم ان کی کھالوں سے خیمے تیار کرتے ہو اور ان کے بالوں اور اُون کو دوسرے بے شمار مصارف میں لاتے ہو۔ پھر ذرا بارش پر غور کرو۔ اللہ تعالیٰ پانی برساتا ہے جسے تم اپنی پیاس بجھانے کے کام میں بھی لاتے ہو اور کاشت کا ذریعہ بھی بناتے ہو۔ چنانچہ اللہ اس کے

ذریعے تمہارے لیے غلہ اور زیتون' کھجور اور انگور' اور بے شمار دوسرے پھل اُگاتا ہے جن سے تم رزقِ حسن بھی حاصل کرتے ہو اور سُکر و سرور پیدا کرنے والی چیزیں بھی۔ پھر ذرا یہ تو دیکھو کہ اس زمینی پیداوار میں کتنی رنگا رنگی و بوقلمونی موجود ہے! کیسے کیسے حسین و جمیل اور رنگا رنگ پھول اس نے کھلا دیے ہیں اور کتنی انواع و اقسام کے پھل اس نے تمہارے لیے پیدا کیے ہیں...... پھر ذرا غور کرو کہ رات اور دن کا نظام کس طرح تمہاری ضروریات کی فراہمی میں لگا ہوا ہے اور شمس و قمر اور تمام اجرامِ فلکی کیسے تمہاری چاکری میں مصروف ہیں...... پھر ذرا سمندر پر بھی نظر ڈالو کہ کیسے تمہاری خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ اس میں سے تم تازہ اور عمدہ گوشت بطورِ غذا حاصل کرتے ہو' اس کے سینے کو اپنے سفینوں سے چیرتے ہو' اور اس کی گہرائیوں میں سے رنگا رنگ موتی اور دوسرا سامانِ آرائش نکالتے ہو...... ﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (آیت ۱۸) واقعہ یہ ہے کہ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو کبھی اُن کا شمار پورا نہ کر سکو! اور ذرا پہاڑوں کو دیکھو کہ زمین کے لیے کیسے لنگروں کا کام دے رہے ہیں اور زمین کو دیکھو کہ اسے کس طرح دریاؤں اور قدرتی شاہراہوں سے مزین کر دیا گیا ہے! اور تو اور ذرا ہماری ننھی سی مخلوق شہد کی مکھی کو دیکھو کہ کس طرح انواع و اقسام کے پھلوں اور پھولوں سے رس چوس کر تمہارے لیے وہ رنگا رنگ مشروب تیار کرتی ہے جس میں تمہارے لیے غذائیت بھی ہے اور بے شمار امراض کی دوا و شفا بھی: ﴿اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝۷۱﴾ تو کیا اے نبیؐ! یہ اللہ کی نعمتوں کا انکار کر دیں گے؟ اب ذرا نگاہ کو خود اپنے نفوس پر مرتکز کرو' اللہ نے تمہیں ماؤں کے پیٹوں سے برآمد کیا اس حال میں کہ تمہیں نہ کوئی علم تھا نہ شعور' اس نے تمہیں سماعت' بصارت اور دل و دماغ ایسی نعمتیں عطا فرمائیں' پھر تمہیں طرح طرح سے رزق عطا فرمایا اور انواع و اقسام کا ساز و سامان عطا کیا۔ مزید برآں تمہیں اپنی ہی جنس سے جوڑا عطا کیا اور اُس سے اولاد عطا فرمائی:

﴿اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۝۷۲﴾

''تو کیا پھر بھی یہ باطل کے اقرار اور اللہ کی نعمتوں کے انکار کی روش پر قائم

رہیں گے؟''

پھر ذرا پرندوں کو دیکھو کہ کیسے فضا میں تیرتے پھرتے ہیں۔ پھر اپنے گھروں کا دھیان کرو' انہیں اللہ نے تمہارے لیے کس طرح امن اور سکون کا گہوارہ بنا دیا ہے۔ مزید برآں درختوں کے سائے اور پہاڑوں کے غاروں پر غور کرو کہ کیسے سورج کی تمازت اور دوسرے موسمی اثرات سے تمہیں بچاتے ہیں۔ پھر اپنے لباس پر غور کرو جو تمہارے لیے ذریعۂ حفاظت بھی ہے اور موجب زینت بھی۔ پھر ذرا زرہوں اور خودوں کو دیکھو کہ وہ تمہیں حملہ آوروں سے کیسے محفوظ رکھتے ہیں:

﴿كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿٨١﴾﴾

''اسی طرح اللہ اپنی نعمتوں کا اتمام فرماتا ہے تم پر تاکہ تم (اس کی) اطاعت قبول کر لو!''

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٨٢﴾﴾

''تو (اے نبی!) اگر یہ پھر بھی اعراض کریں تو آپ کے ذمے تو بس صاف صاف پہنچا دینا ہے!''

ان بدبختوں کا حال یہ ہے کہ:

﴿يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٣﴾﴾

''یہ اللہ کی نعمتوں کو پہچاننے کے بعد اُن کا انکار کرتے ہیں اور اُن کی اکثریت ناشکروں پر مشتمل ہے۔''

الغرض اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا مرکز ومحور اللہ تعالیٰ کی گوناگوں نعمتوں کا ذکر اور ان کے حوالے سے اللہ کی توحید اور اس کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ پر ایمانِ محکم اور بعث بعد الموت اور جزا و سزا اور وحیٔ نبوت اور رسالت پر پختہ یقین کی دعوت ہے۔ چنانچہ اُس کے آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں بھی: ''شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ'' کے الفاظ خصوصیت سے وارد ہوئے' یعنی یہ کہ:

''وہ اللہ کی نعمتوں پر بھرپور شکر ادا کرنے والے تھے!'' (آیت ۱۲۱)

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ: ''حکمتِ قرآنی'' کے قصرِ عظیم کی

بنیاد اسی جذبۂ شکرِ الٰہی پر قائم ہے بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ﴾ (لقمٰن:۱۲)

''اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ کر شکر اللہ کا!''

چنانچہ سورۃ النحل میں حکمتِ قرآنی کی اس اساس کو محکم طور پر قائم کر دیا گیا اور بعد کی دو سورتوں یعنی سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں اس حکمت کے مضمرات و متضمنات کو کھول دیا گیا اور اس کے ثمرات و نتائج کو بیان کر دیا گیا۔ چنانچہ سورۃ النحل کے آخر میں وارد ہوئے یہ الفاظِ مبارکہ کہ:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (آیت ۱۲۵)

''بلاؤ اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت سے اور عمدہ نصیحت سے اور مجادلہ و مباحثہ کرو اس طور سے جو بہت عمدہ و اعلیٰ ہو۔''

اور سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا کہ:

﴿ذٰلِكَ مِمَّا اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ﴾ (آیت ۳۹)

''یہ باتیں ہیں منجملہ اس حکمت کے جو تیرے ربّ نے تجھ پر نازل فرمائی۔''

اس سے سورۃ النحل اور سورۂ بنی اسرائیل کے مضامین کے باہمی ربط کا ایک اہم پہلو بھی واضح ہو گیا! واضح رہے کہ ان الفاظِ مبارکہ میں خصوصی اشارہ ہے سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں وارد شدہ اوامر و نواہی کی جانب جو ایک صحت مند اور صالح معاشرے کی تعمیر کے لیے لازمی و لابدی ہیں، اور اُن کی حیثیت اصل میں سورۃ النحل کی آیت ۹۰ کی شرح و تفسیر کی ہے، جس میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۹۰﴾

''یقیناً اللہ حکم دیتا ہے (تمہیں) انصاف کا اور احسان کا اور قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی کا اور منع فرماتا ہے (تمہیں) بے حیائی اور بدی اور ظلم و تعدی سے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، تاکہ تم سبق حاصل کرو۔''

سورۃ النحل اور سورۂ بنی اسرائیل کے مابین ایک اور مشترک موضوع ہجرت کا ہے۔ ہجرت کا سلسلہ اگرچہ ویسے تو ۶ نبوی ہی میں ہجرتِ حبشہ سے شروع ہو گیا تھا‘ لیکن سورۃ النحل اور سورۂ بنی اسرائیل میں جس ہجرت کا ذکر ہے وہ یقیناً ہجرتِ مدینہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ نحل اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب آنحضور ﷺ کی اجازت سے مسلمانوں نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت شروع کر دی تھی۔ چنانچہ پہلے آیت ۴۱ میں فرمایا:

’’جن لوگوں نے ہجرت کی اللہ کی راہ میں اس کے بعد کہ ان پر ظلم ڈھائے گئے‘ ہم انہیں لازماً اس دنیا میں بھی اچھا ٹھکانا عطا فرمائیں گے اور آخرت کا اجر تو اعظم و اکبر ہے ہی‘ کاش کہ انہیں معلوم ہوتا!‘‘

اور پھر آیت ۱۱۰ میں فرمایا:

’’پھر جن لوگوں نے آزمائش کی بھٹیوں میں ڈالے جانے کے بعد ہجرت کی‘ پھر جہاد کیا اور صبر کی روش اختیار کی‘ یقیناً تیرا ربّ ان باتوں کے بعد حد درجہ غفور بھی ہے نہایت رحیم بھی!‘‘

سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف کی طرح سورۃ النحل میں بھی وحیٔ الٰہی اور اُس کے آخری اور جامع و کامل ایڈیشن قرآنِ حکیم کا ذکر بتکرار و اعادہ آیا ہے۔ چنانچہ آیت ۲ میں فرمایا:

’’اللہ نازل کرتا ہے فرشتوں کو روح (یعنی وحی) کے ساتھ اپنے امر سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے کہ لوگوں کو خبردار کر دو (اور منادی کر دو) کہ میرے سوائے کوئی معبود نہیں‘ پس صرف مجھ ہی سے ڈرو!‘‘

پھر آیات ۲۴‘ ۲۵ اور ۳۰ میں واضح فرمایا کہ اس تنزیل پر کفار اور اہل ایمان کا ردّ عمل کس قدر مختلف بلکہ متضاد ہے‘ چنانچہ آیت ۲۴ میں فرمایا:

’’اور جب ان سے دریافت کیا جاتا ہے کہ تمہارے ربّ نے کیا نازل فرمایا تو وہ کہتے ہیں: وہی داستان ہائے پارینہ۔‘‘

اِس پر آیت ۲۵ میں تبصرہ فرمایا گیا کہ:

’’(اس سبب سے) یہ لوگ قیامت کے دن اپنے بوجھ تو پورے اٹھائیں گے ہی‘ اس کے علاوہ انہیں اُن کے بوجھ بھی اٹھانے پڑیں گے جنہیں یہ لاعلمی و نادانی میں گمراہ

کر رہے ہیں، کتنا برا ہوگا وہ بوجھ جو یہ اٹھائیں گے!"

اس کے بالمقابل آیت ۳۰ میں فرمایا:

"اور (دوسری طرف جب) اہل اصلاح وتقویٰ سے سوال کیا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل فرمایا تو کہتے ہیں: "سرتاسر خیر"۔ ان خوب کاروں کے لیے اس دنیا میں بھی خیر اور بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو (ان کے لیے) ہے ہی سرتاسر خیر و خوبی۔ اور فی الواقع بہت ہی اچھا ہوگا متقیوں کا ٹھکانا۔"

سورت کے اواخر میں ایک بار پھر قرآن مجید کی عظمت بھی بیان ہوئی اور اس کے اعجاز کی جانب بھی اشارہ ہوا اور اس کی تلاوت کے آداب بھی تعلیم فرمائے گئے۔ چنانچہ آیت ۸۹ میں فرمایا:

"اور (اے نبیؐ!) ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمائی ہر چیز کی وضاحت کے لیے اور اطاعت شعاروں کے حق میں ہدایت اور رحمت اور بشارت بنا کر۔"

اور آیت ۱۰۲ میں فرمایا:

"کہہ دو (اے نبیؐ!) کہ اتارا ہے اُسے رُوح القدس نے تیرے ربّ کی جانب سے حق کے ساتھ تاکہ ثبات عطا کرے اہل ایمان کو اور ہدایت اور بشارت بنے اطاعت گزاروں کے حق میں!"

ساتھ ہی اگلی آیت میں واضح کر دیا کہ:

"ہمیں خوب معلوم ہے کہ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ (قرآن) انہیں (یعنی محمد ﷺ کو) کوئی انسان سکھا رہا ہے۔ حالانکہ جس شخص کی جانب وہ اسے منسوب کر رہے ہیں وہ عجمی ہے اور یہ قرآن صاف اور ستھری عربی زبان میں ہے۔"

آدابِ تلاوتِ قرآن کے ذیل میں آیت ۹۸ میں فرمایا:

"پس جب قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو پہلے شیطانِ مردود کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کر لیا کرو۔"

اس کے ساتھ ہی آیت ۱۲۵ کو بھی شامل کر لینا چاہیے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، یعنی یہ کہ:

"بلاؤ اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت سے اور موعظۂ حسنہ سے اور ان سے بحث و نزاع کی ضرورت پڑ ہی جائے تو وہ اس طور سے کرو جو اعلیٰ و احسن ہے۔"

اس لیے کہ اس آیۂ مبارکہ میں دعوت کے ضمن میں جن تین چیزوں کی جانب رہنمائی کی گئی ان میں سے بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿ذٰلِكَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤى اِلَيۡكَ رَبُّكَ مِنَ الۡحِكۡمَةِ﴾ (بنی اسراء یل:۳۹)

حکمت بھی قرآن ہی کا ایک جزو ہے اور بفحوائے الفاظِ ربانی:

﴿قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوۡرِ﴾

(یونس:۳۹)

موعظۂ حسنہ بھی قرآن ہی کا ایک حصہ ہے اور مباحثے اور مجادلے کی احسن صورتیں بھی وہی ہیں جو قرآن مجید میں وارد ہوئیں۔ اس طرح یہ آیت گویا شرح ہے سورۂ قٓ کی آخری آیت کی کہ:

﴿فَذَكِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مَنۡ يَّخَافُ وَعِيۡدِ۝۴۵﴾

''پس یاددہانی کراؤ قرآن کے ذریعے اسے جسے ہماری دھمکیوں اور وعیدوں کا ذرا بھی خوف ہے۔''

☆ ''شہادت علی الناس'' کا جو مضمون مدنی سورتوں میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے وہ ہجرت سے متصلاً قبل نازل ہونے والی دو سورتوں یعنی سورۃ الحج اور سورۃ النحل میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج میں تو اس کا وہ دُنیوی پہلو واضح کیا گیا ہے جسے سورۃ البقرۃ میں اُمت مسلمہ کی غرضِ تاسیس قرار دیا گیا ہے اور سورۃ النحل میں اس کا وہ اُخروی پہلو دو آیات میں بیان کیا گیا جو سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ میں مذکور ہے۔ یعنی:

''اور جس دن کہ ہم کھڑا کریں گے ہر اُمت میں سے ایک گواہ' پھر ان کافروں کو نہ اس کی اجازت ملے گی (کہ خواہ مخواہ کے جھوٹے بہانے بنائیں) اور نہ ہی اُن کے غیظ وغضب کی پرواہ کی جائے گی۔'' (آیت ۸۴)

اور:

''اور جس دن کہ ہم کھڑا کریں گے ہر اُمت میں سے ایک گواہ اُن ہی میں سے ہوگا اور اُن ہی کے خلاف گواہی دے گا اور کھڑا کریں گے اے نبیؐ! آپ کو ان لوگوں کے خلاف گواہ بنا کر!'' (آیت ۸۹)

یاد ہوگا کہ اسی کی ہم مضمون ہے سورۃ النساء کی وہ آیت جسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سن کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے!

☆ حکمتِ دین کے ضمن میں عہدِ اَلست کی یاددہانی بھی اس سورۂ مبارکہ میں تاکیداً کرائی گئی ہے۔ چنانچہ آیت ۹۱ میں فرمایا:

﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ﴾

''اوراللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم (اللہ سے) معاہدہ کر چکے ہو۔''

اور آیت ۹۲ میں ایک حددرجہ بلیغ تشبیہہ کے ذریعے اس عہد کو توڑنے پر ملامت کی گئی کہ:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا﴾

''اوراس عورت کی مانند نہ بن جاؤ جس نے بڑی محنت ومشقت سے کا تا ہوا سوت خود ہی توڑ پھوڑ کرر کھ دیا۔''

اور آیت ۹۵ میں ایک دوسرے انداز میں توجہ دلائی کہ:

''اوراللہ کے عہد کے عوض حقیر سی قیمت قبول نہ کرلو' یقیناً جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ تمہارے لیے کہیں بہتر ہے' اگر تم سمجھو!''

☆ سورت کے آخر میں بنی اسرائیل کے ضمن میں دو حقائق کی جانب مجمل اشارے کیے گئے: ایک کھانے پینے کی چیزوں کی حلت وحرمت کے ضمن میں کہ ان پر بعض سخت پابندیاں تادیباً وتعزیراً عائد کی گئی تھیں اور دوسرے یومِ سبت کے بارے میں کہ یہ بھی ان پر یومِ جمعہ کی ناقدری کی پاداش میں مقرر کیا گیا تھا۔ یہ گویا تمہید ہے اُس تفصیلی ذکر کی جو یہود کی تاریخ کے ضمن میں سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے ہی رکوع میں آ رہا ہے۔ پھر اسی سلسلے میں غالباً یہود ہی کی توجہ کے لیے واضح کر دیا گیا کہ اب بھی توبہ کے ذریعے اللہ کی رحمت کے دروازے کو کھٹکھٹایا جا سکتا ہے............فرمایا:

''پھر تیرے ربّ کی رحمت دستگیری فرماتی ہے اُن کی جو نادانی سے (جذبات کی رَو میں بہہ کر) برائی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں' لیکن پھر توبہ کرتے ہیں اور اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔ تو اس کے بعد تیرا ربّ یقیناً حد درجہ بخشنے والا بھی ہے (اور) نہایت رحم

والا بھی۔'' (آیت ۱۱۹)

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الرَّحِمِیْنَ

تقریر نمبر ۱۵

سورۂ بنی اسرائیل والکہف

نبی اکرم ﷺ نے قرآن مجید کی بعض سورتوں کو آپس میں بہنیں قرار دیا ہے' جیسے مثلاً آپؐ نے فرمایا کہ:

((شَیَّبَتْنِیْ ھُوْدٌ وَ اَخَوَاتُھَا))

''مجھے سورۂ ہود اور اُس کی بہنوں نے بوڑھا کر دیا ہے!''

اس تشبیہہ کو ذرا اور آگے بڑھایا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف آپس میں بالکل جڑواں بہنوں کے مانند ہیں۔ اس لیے کہ مصحف کے عین وسط میں واقع حکمتِ قرآنی کے ان دو عظیم خزینوں کے مابین حد درجہ مشابہت ومماثلت پائی جاتی ہے۔ مثلاً قد وقامت ہی کو لیجیے' تو دونوں ٹھیک بارہ بارہ رکوعوں پر مشتمل ہیں اور تعداد آیات میں بھی صرف ایک کا فرق ہے' یعنی سورۂ بنی اسرائیل ۱۱۱ آیات پر مشتمل ہے اور سورۂ کہف ۱۱۰ پر۔ پھر ایک کا آغاز تسبیح خداوندی سے ہوتا ہے اور دوسری کا حمد باری تعالیٰ سے' اور ان دونوں کے مابین نسبت کو آنحضور ﷺ نے اپنے اس فرمان میں واضح فرما دیا کہ:

((اَلتَّسْبِیْحُ نِصْفُ الْمِیْزَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَؤُہٗ)) (۱)

''یعنی سبحان اللہ سے میزان نصف ہو جاتی ہے اور الحمد للہ سے پُر ہو جاتی ہے۔''

پھر دونوں کی پہلی آیتوں میں آنحضور ﷺ کا ذکر ہے اور دونوں میں آپ ﷺ کی نسبت عبدیت ہی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنحضور ﷺ پر خصوصی شفقت وعنایت کا اظہار ہوتا ہے وہاں نسبتِ رسالت

(۱) رواہ مسند احمد' کتاب باقی مسند الآثار' باب احادیث رجال من اصحاب النبی ﷺ۔

کے بجائے اسی نسبت عبدیت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ اس لیے بھی کہ اس سے شرک کا سدّ باب ہوتا ہے اور اس لیے بھی کہ نسبتِ عبدیت عروجی ہے اور اس کا رُخ اللہ کی جانب ہے اور نسبتِ رسالت نزولی ہے اور اس کا رُخ انسانوں کی جانب ہے۔ گویا نسبت عبدیت سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کی جامع ہے جب کہ نسبت رسالت عبارت ہے سیر عن اللہ الی اللہ سے۔ چنانچہ آنحضورﷺ کا اصل سرمایۂ افتخار یہی عبدیت کاملہ کا مقام ہے۔ اگرچہ ہم آنحضورﷺ کی عبدیت کو اپنی عبدیت پر قیاس نہیں کر سکتے۔ بقول علامہ اقبال:

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر

ما سراپا انتظار ' اُو منتظر!

اسی طرح ان دونوں سورتوں کی آخری آیتوں پر نگاہ ڈالیے تو نظر آئے گا کہ دونوں شرک کی نفی اور توحید کے اثبات کے ضمن میں حد درجہ عظمت کی حامل ہیں' چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل کا اختتام ہوا اس آیت پر کہ:

﴿وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ﴿۱۱۱﴾﴾

''اور کہہ دو ساری تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جس نے نہ کسی کو اپنا بیٹا بنایا' نہ ہی بادشاہی اور اختیار میں کوئی اُس کا ساجھی ہے' نہ ہی اُس کا کوئی دوست اس کے کسی ضعف یا احتیاج کے سبب سے ہے' اور اُس کی بڑائی کرو جیسا کہ اُس کی بڑائی کا حق ہے۔''

اور سورۃ الکہف کا اختتام ہوا اُن الفاظ پر کہ:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾﴾

''کہہ دو (اے نبیؐ!) کہ میں بھی تمہارے جیسا بشر ہوں' مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود تو بس ایک ہی معبودِ برحق ہے' تو جو کوئی اپنے ربّ سے ملاقات کا امیدوار ہو اُسے چاہیے کہ عمل کرے نیک اور شریک نہ کرے اُس کی عبادت میں کسی کو!''

دونوں آیات کا آغاز فعل امر ''قُلْ'' سے ہوا ہے اور دونوں میں شرک کی نفی اور توحید کا اثبات ہے' اِس فرق کے ساتھ کہ ایک میں اللہ کو اولاد یا ضعف و احتیاج سے متصف کر کے اس کے مقامِ رفیع سے گرا کر مخلوق کی صف میں لا کھڑا کرنے کی مذمت کی گئی ہے تو دوسری میں مخلوق میں سے کسی کو اُٹھا کر اللہ کے برابر لے جا بٹھانے کا سدباب کیا گیا ہے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کی جملہ انواع و اقسام میں ان دونوں میں سے کوئی ایک صورت ضرور پائی جاتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ یہی عروجی و نزولی کیفیات ہیں جو ان سورتوں کی پہلی آیات میں آنحضور ﷺ کے ضمن میں بیان ہوئیں' یعنی سورۂ بنی اسرائیل کا آغاز ہوا معراج کے ذکر سے جس میں آنحضور ﷺ کو بلندیوں پر لے جایا گیا بفحوائے الفاظ حدیث: ((ثُمَّ عُرِجَ بِی))[1] اور سورۂ کہف کا آغاز ہوا کلامِ الٰہی کے آنحضور ﷺ پر نزول کے ذکر سے! یعنی:

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِهِ الۡکِتٰبَ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجًا ①﴾

''کل شکر اور تمام تعریف کا مستحق ہے اللہ جس نے نازل فرمائی اپنے بندے پر کتاب ہدایت اور نہ رکھی اُس میں ہرگز کوئی کجی!''

اب ایک نگاہ سورۂ بنی اسرائیل کی آخری اور کہف کی پہلی آیت پر دوبارہ ڈال لیجیے۔ بنی اسرائیل کی آخری آیت کا آغاز ہوا: ''**قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ**'' کے الفاظ سے اور سورۃ الکہف کا آغاز ہوا ''**اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ**'' سے۔ گویا ایک میں امر ہے اور دوسری میں امتثالِ امر' اور اس طرح ان دونوں سورتوں نے فی الواقع جڑواں بہنوں کی صورت اختیار کر لی۔

اوّل و آخر کی ان مشابہتوں کے علاوہ حسب ذیل مزید اُمور بھی ان دونوں سورتوں میں مشترک ہیں۔

اوّلاً: دونوں کے تقریباً وسط میں قصۂ آدم و ابلیس کا اجمالی ذکر موجود ہے۔

ثانیاً: دونوں ''**اُولو العزمِ مِنَ الرُّسل**'' یا ان کی قوموں پر عذابِ الٰہی کے ذکر سے خالی ہیں' اگرچہ بستیوں کی تباہی و بربادی کا مجمل ذکر دونوں میں موجود ہے!

ثالثاً: دونوں میں قرآن مجید کے بارے میں فرمایا گیا کہ ہم نے اس میں انسانوں کی

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصلاۃ' باب کیف فرضت الصلاۃ فی الاسراء۔

ہدایت ورہنمائی کے لیے ہر ممکن اسلوب اختیار کرلیا ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ﴾ (آیت۸۹)

''ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو ہر طرح سے سمجھایا ہے''۔

اور سورۂ کہف میں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ﴾ (آیت۵۴)

رابعاً: دونوں میں واضح کردیا گیا کہ انسان اپنی شامتِ اعمال سے اپنے اوپر ہدایت کے راستے بند کرالیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے قانونِ ہدایت وضلالت کی زد میں آکر اُن کا حال یہ ہوجاتا ہے کہ:

﴿اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اَکِنَّۃً اَنْ یَّفْقَھُوْہُ وَفِیْۤ اٰذَانِھِمْ وَقْرًا﴾ (الکہف:۵۷)

''یقیناً ہم نے ڈال دیے ہیں ان کے دلوں پر پردے کہ سمجھ نہ پائیں اسے اور پیدا کردی ہے اُن کے کانوں میں گرانی (کہ سن نہ سکیں)!''

خامساً: دونوں میں آنحضورﷺ کو خبردار کیا گیا ہے کہ اب جبکہ سردارانِ قریش تھک ہار کر مصالحت کی پیشکش پر اتر آئے ہیں' مبادا آپ اپنی طبعی شرافت ومروت کے باعث کسی درجے میں اُن کی جانب جھک جائیں۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

''اور قریب تھا کہ یہ لوگ آپؐ کو فتنے میں ڈال کر اُس چیز سے ہٹا دیتے جو ہم نے آپ پر وحی کی ہے' تاکہ آپ گھڑ کر منسوب کردیتے ہماری جانب کوئی اور چیز اور تب وہ بنالیتے آپ (ﷺ) کو اپنا گاڑھا دوست! اور اگر ہم نے آپ (ﷺ) کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو کیا عجب کہ آپ اُن کی جانب کسی قدر جھک ہی جاتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم آپﷺ کو زندگی اور موت دونوں کے دُگنے عذاب کا مزا چکھاتے' پھر آپ نہ پاتے ہمارے مقابل میں کوئی مددگار!'' (آیات ۷۳۔۷۵)

اور سورۃ الکہف میں فرمایا:

''اور اپنے دل کو اُن لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو (اور ان کی رفاقت کو غنیمت جانو) جو اپنے ربّ کی رضاجوئی میں صبح وشام اُس کو پکارتے رہتے ہیں' اور نہ ہٹیں آپ (ﷺ) کی نگاہیں اُن سے حیاتِ دُنیوی کی زینتوں کی خاطر اور نہ ہی کسی ایسے شخص کی اطاعت

کرو (اُس کی باتوں پر دھیان نہ دو) جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کر لی ہے!'' (آیت ۲۸)

واضح رہے کہ قرآن کے معروف اسلوب کے مطابق ان دونوں مقامات پر بظاہر خطاب آنحضور ﷺ سے ہے' لیکن عتاب کا رُخ دراصل معاندین اور کفار کی جانب ہے۔

سادساً : دونوں سورتوں میں واضح کر دیا گیا کہ حق و باطل کی کش مکش کی شدت اور مصائب و مشکلات اور ابتلاء و آزمائش کے دور میں بندۂ مؤمن کا اصل سہارا کلامِ الٰہی ہے!

چنانچہ سورۃ الکہف میں فرمایا:

﴿وَاتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ﴾ (آیت ۲۷)

''اور پڑھتے رہا کرو جو نازل کیا گیا تمہاری جانب تمہارے ربّ کی طرف سے۔''

اور سورۂ بنی اسرائیل میں اس تلاوت قرآن کے لیے بہترین اوقات کی جانب رہنمائی فرمادی۔ یعنی:

﴿...... وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴿۷۸﴾﴾

''اور (خصوصی اہتمام) کرو فجر کی قراءتِ قرآن کا' یقیناً فجر کی قراءات خاص حضوری کی کیفیات کی حامل ہوتی ہیں''۔

اور:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (آیت ۷۹)

''اور رات کا کچھ حصہ بھی اس قرآن کے ساتھ جاگتے ہوئے بسر کرو' یہ تمہارے لیے خصوصی اضافہ ہے!''

الغرض سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں مشابہت اور مماثلت کے بے شمار پہلو ہیں جن کا احاطہ اس مختصر گفتگو میں ممکن نہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے اور آخری رکوع میں' اپنے نام کی مناسبت سے بنی اسرائیل کی تاریخ کے بعض اہم گوشوں کا ذکر ہے۔ چنانچہ پہلے رکوع میں ان کی تاریخ کے درمیانی دَور میں دو بار اُن کی سرکشی اور بغاوت اور اس پر اللہ کی سخت سزا و سرزنش کا ذکر کیا گیا

اوراس کے بعد فرمایا گیا کہ اب پھر تم ایک فیصلہ کن موڑ پر کھڑے ہو۔ اگر قرآن پر ایمان لاؤ اور اسے اپنا رہنما بناؤ تو رحمتِ خداوندی پھر تمہیں اپنے سائے میں لے لے گی۔ بصورتِ دیگر اللہ کے سخت سے سخت تر عذاب کے کوڑے تمہاری پیٹھ پر برستے رہیں گے۔

﴿عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یَّرۡحَمَکُمۡ ۚ وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا ۘ وَجَعَلۡنَا جَہَنَّمَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ حَصِیۡرًا ۝۸ اِنَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ یَہۡدِیۡ لِلَّتِیۡ ہِیَ اَقۡوَمُ وَیُبَشِّرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا کَبِیۡرًا ۝۹ وَّاَنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ اَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ۝۱۰﴾

''اُمید ہے کہ تمہارا ربّ تم پر رحم کرے' لیکن اگر تم نے (اپنی سابقہ روش کا) اعادہ کیا تو ہم بھی پھر (اپنی سزا کا) اعادہ کریں گے۔ اور کافروں کے لیے ہم نے جہنم کو قید خانہ بنا رکھا ہے۔ یقیناً یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے اور وہ ایسے اہل ایمان کو شہادت دیتا ہے جو نیک کام کرتے ہیں کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ اور جو آخرت کو نہیں مانتے ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

اور آخری رکوع میں ایک جانب اُمت مسلمہ کی حیثیت سے اُن کی تاریخ کے آغاز کا ذکر ہوا' یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت کا خلاصہ۔ واضح رہے کہ پہلے رکوع میں اس حقیقت کی جانب بھی اشارہ ہے کہ اُمت کی تاسیس کتابِ الٰہی ہی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے ایک اُمت مسلمہ کی حیثیت اُسی وقت اختیار کی تھی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا ہوئی:

﴿وَاٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَجَعَلۡنٰہُ ہُدًی لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ﴾ (آیت۲)

''اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت (کا ذریعہ) بنا دیا''۔

اور دوسری طرف اُن کی اس آخری تباہی کی جانب اشارہ کر دیا گیا جو قیامت کے قریب حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کے بعد ہوگی۔ چنانچہ فرمایا کہ جب وہ وقت آئے گا تو ہم تمہیں ہر طرف سے سمیٹ کر لے آئیں گے:

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَۃِ جِئۡنَا بِکُمۡ لَفِیۡفًا ۝۱۰۴﴾

جس کی صورت اِس وقت نگاہوں کے سامنے ہے کہ کوئی غیبی ہاتھ ہے جو پوری دنیا سے یہودیوں کو کھینچ کھینچ کر فلسطین میں جمع کر رہا ہے' جسے بالآخران کا قبرستان بنا دیا جائے گا۔ (وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ)

عجیب بات ہے کہ جس طرح پہلے رکوع میں یہود کے ذکر کے بعد قرآن کا ذکر ہوا' اسی طرح آخری رکوع میں بھی یہود کی تاریخ کے آغاز و انجام کی جانب اجمالی اشاروں کے بعد وارد ہوئے یہ انتہائی پُر ہیبت و پُر جلال الفاظ کہ:

﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ﴾ (آیت ۱۰۵)

''اور اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل فرمایا ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے۔''

اب قوموں اور اُمتوں کی قسمتوں کا فیصلہ اسی کے ذریعے ہوگا۔ یہ گویا یہود سے وہی بات کہی جا رہی ہے جو سورۃ الطارق میں ایک عام قاعدہ کلیہ کے طور پر فرمائی گئی کہ:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾﴾

یعنی یہ قرآن فیصلہ کن بات بن کر نازل ہوا ہے' اسے ہنسی مذاق اور دل لگی کی بات نہ سمجھو۔

اس کے علاوہ اس سورۂ مبارکہ کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں' بقول حبر الاُمہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تورات کے احکام عشرہ یعنی The Ten Commandments انتہائی دل نشین پیرائے میں بیان کر دیے گئے تاکہ اہل کتاب جان لیں کہ اُصولاً قرآن مجید کی تعلیم بھی وہی ہے جو تورات کی تھی۔ اس طرح ایک جانب دعوت اور افہام و تفہیم اور دوسری طرف انذار اور تہدید و وعید دونوں اعتبارات سے سورۂ بنی اسرائیل تمہید بن گئی اُس مفصل گفتگو کی جو ہجرت کے بعد مدنی سورتوں میں یہود و نصاریٰ کو براہِ راست خطاب کر کے کی گئی!

خود ہجرت کی جانب ایک اشارہ اس سورۂ مبارکہ میں ایک دُعا کی صورت میں کیا گیا جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین فرمائی گئی' یعنی:

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾﴾

''اور (اے نبیؐ!) دعا کرو کہ اے میرے ربّ! مجھے داخل فرما عزت کا داخل کرنا اور باہر نکال عزت کا باہر نکالنا' اور مجھے اپنے خاص خزانۂ فضل سے عطا فرما قوت و غلبہ جو (میرے مشن کی تکمیل میں) معاون و مددگار رہو!''

یہ ایک نہایت اعلیٰ مثال ہے اس کی کہ خاصانِ بارگاہِ ربانی کو دعا کے الفاظ بھی خدا خود تلقین فرماتا ہے' اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُس دُعا کی قبولیت کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہوتا ہے۔

ایک اور اہم مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں رُوح سے متعلق سوال اور اس کا جواب ہے جو ناسمجھوں یا کج بحثی کے خواہش مند لوگوں کے حق میں تو جوابِ مسکت کی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقی علم و معرفت کے متلاشی لوگوں کے لیے حقائق و معارف کے ایک بحرِ بیکراں کو کوزے میں بند کر دینے کے مترادف ہے۔ رُوح کے بارے میں اس سوال اور اس کے جواب سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں' اس لیے کہ شانِ نزول کی روایات کی رُو سے یہود کے سکھانے سے قریشِ مکہ نے تین سوالات آنحضور ﷺ کے سامنے امتحاناً پیش کیے تھے' ایک یہی کہ رُوح کی حقیقت کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ اصحابِ کہف کا واقعہ کیا ہے؟ اور تیسرے یہ کہ ذوالقرنین کون تھے؟ جن میں سے پہلے کا جواب ہے سورۂ بنی اسرائیل میں اور بقیہ دو کا جواب ہے سورۃ الکہف میں۔

سورۃ الکہف کے بارے میں متعدد مستند احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس پوری سورت کو بالعموم اور اس کی ابتدائی اور آخری آیات کو بالخصوص دجالی فتنے کے اثرات سے بچنے کے لیے مفید قرار دیا ہے۔ دجل عربی زبان میں اسے کہتے ہیں کہ کسی شے کی حقیقت پر کسی فریب کا پردہ ڈال دیا جائے۔ سورۃ الکہف کے پہلے اور آخری رکوع کے مطالعے سے اس دجل کی تعیین ہو جاتی ہے' اور وہ یہ کہ اس دنیا اور اُس کے ساز و سامان کی چمک دمک سے انسان کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جائیں اور وہ خدا اور آخرت دونوں کو بھول جائے۔ چنانچہ پہلے رکوع میں فرمایا:

﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝﴾

''یقیناً ہم نے روئے زمین پر جو کچھ ہے اُسے اُس کا سنگھار اور زینت و آرائش بنا دیا

ہے' تا کہ ہم لوگوں کا امتحان لیں کہ کون اُن میں سے اچھے عمل کرتا ہے!''

یعنی کون اُس کی ظاہری سج دھج سے مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے اور کون اس عروس ہزار داماد کی اصل حقیقت کو پا کر اپنی نگاہوں کو اللہ کی رضا طلبی اور آخرت کی فوز وفلاح پر ہی جمائے رکھتا ہے۔ اور آخری رکوع میں بڑے بلیغ پیرائے میں پہلے سوال کیا کہ:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾﴾

''(اے نبیؐ! ان سے) کہو کہ کیا ہم بتائیں تمہیں کہ سب سے زیادہ خسارے اور گھاٹے میں رہنے والے کون ہیں؟''

اور پھر خود ہی جواب ارشاد فرمایا کہ:

﴿اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾﴾

''وہ لوگ جن کی سعی و جہد اور بھاگ دوڑ اس حیاتِ دُنیوی ہی میں بھٹک کر اکارت چلی گئی' اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں (ہماری محنتیں سپھل ہو رہی ہیں)''۔

اوّل و آخر کی ان دو آیات کو اس سورۂ مبارکہ کے عمود اور مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہے جس کے گرد اُس کے تمام مباحث گھومتے ہیں۔ چنانچہ پہلے رکوع سے متصلاً بعد ہے اصحابِ کہف کا واقعہ اور آخری رکوع سے متصلاً قبل ہے حضرت ذوالقرنین کا ذکر' اور دونوں کا حاصل یہ ہے کہ اہل ایمان کو اس دنیا میں ہر قسم کے حالات سے سابقہ پیش آ سکتا ہے' اصحابِ کہف کی سی کسمپرسی اور بے یار و مددگار ہونے کی حالت سے بھی اور حضرت ذوالقرنین کی سی حکومت و سلطنت اور سطوت و شوکت سے بھی۔ لیکن بندۂ مؤمن کا کام یہ ہے کہ ہر حال میں صابر و شاکر رہے اور ہر حالت کو ابتلاء و آزمائش پر محمول کرے۔ درمیان میں ایک تو مکالمہ نقل ہوا ایک خود آگاہ و خدا مست مردِ عارف اور ایک دنیا کی ظاہری زیبائش و آرائش سے دھوکہ کھائے ہوئے شخص مغرور کے مابین جس سے اسی دجل کی حقیقت ایک تمثیلی پیرائے میں مزید واضح کی گئی' اور دوسرے وہ واقعہ بیان ہوا جو حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے مابین پیش آیا جس سے اسی تصویر کا دوسرا رُخ واضح کر دیا گیا کہ جس طرح اس دنیا کی دولت و ثروت اور عزت و وجاہت بے حقیقت ہے اسی طرح

یہاں کے مصائب وآ لام بھی سراب ہی کی حیثیت رکھتے ہیں' بلکہ بسا اوقات وہی چیز انسان کے حق میں موجب خیر و برکت ہوتی ہے جسے وہ اپنی لاعلمی اور ناسمجھی میں باعثِ خسران و نقصان و موجب ذلت و رسوائی سمجھ رہا ہوتا ہے۔ مزید برآں' ایک تو آنحضورﷺ سے خطاب کر کے فرمایا کہ قریش کے صاحبِ دولت وثروت سرداروں اور چوہدریوں کی جانب زیادہ التفات نہ فرمائیں' مبادا کسی کو یہ گمان ہو کہ آپ ﷺ بھی دنیا کی زینت اور چمک دمک سے مرعوب ومتأثر ہو گئے ہیں۔ اور دوسرے ایک نہایت فصیح و بلیغ تمثیل سے حیاتِ دُنیوی کی اصل حقیقت کو کھول کر بیان کر دیا گیا۔ جس کے ضمن میں وارد ہوئے وہ نہایت سادہ مگر حد درجہ دل نشین الفاظ کہ:

﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا﴿٤٦﴾﴾

''(لوگو!) یہ مال اور اولاد تو بس اس حیاتِ دُنیوی کی زینت و آرائش ہیں' اور تمہارے ربّ کی نگاہوں میں وقعت کے حامل اور اُمید کے اعتبار سے بھروسے کے قابل تو صرف وہ نیک اعمال ہیں جنہیں دوام بھی ہے اور بقاء بھی۔''

اور واقعہ یہ ہے کہ یہی ہے وہ سو باتوں کی ایک بات کہ اگر دل میں جم جائے تو انسان کی زندگی کا نقشہ یکسر بدل کر رہ جائے اور وہ بجائے اس دُنیا کی چمک دمک سے مرعوب ومبہوت ہونے اور اس میں گم ہو کر رہ جانے کے' اللہ ہی کو اپنا محبوب ومطلوب اور آخرت ہی کو اپنی منزلِ مقصود جانتے ہوئے اس دنیا سے ایسے گزر جائے جیسا کہ آنحضورﷺ نے فرمایا کہ:

((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ)) (۱)

''دُنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی یا راہ چلتا مسافر۔''

اللہ ہمیں اس کی ہدایت و توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ!

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب قول النبی کن فی الدنیا کانك غریب

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ......اور...... اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ -اور- غلبہ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ